ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اپریل ۲۰۱۸ء | جلد ۹ | شمارہ ۱۰ | رجب المرجب ۱۴۳۹ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9808850029
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00 روپے
سالانہ:	250:00 روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00 روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00 روپے

خط و کتابت کا پتہ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر 'ڈی' کوارسی بائی پاس، علی گڑھ 202002

e-mail: nidaeaetidal@gmail.com, visit us: www.nadwifoundatioaligarh.org

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at *Ideal Graphics Enterprises*, Patwari Nagla, Aligarh

Dsg. & Comp. by: Abdur Rehman Araria, # arehman412@yahoo.in

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	اسلام میں انسانیت کا احترام	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	عالمی یوم خواتین کا فریب اور اردوغان کا بیان	مدیر	۳
۳۔	شام کا ماتم	سقوط حلب کے بعد سقوط غوطہ دمشق	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۱
۴۔	پیام سیرت	شہید ماں کا پیغام	محمد فرید حبیب ندوی	۱۹
۵۔	خاص تحریر	ایک بلبل ہے کہ محو ترنم اب تک	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۲۱
۶۔	تعزیت	ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمیؒ-حیات اور کارنامے	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	۲۴
۷۔	نقطۂ نظر	کثیر جہتی تہذیب اور افکارِ سعید نورسی	ندیم احمد انصاری	۳۰
۸۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۳۴
۹۔	انکار حدیث	استاد احمد امین اور حدیث پر اعتراضات	محمد فرید حبیب ندوی	۳۶
۱۰۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۲۵)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۰
۱۱۔	فقہی مباحث	بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب (قسط-۱)	محمد قمر الزماں ندوی	۴۳
۱۲۔	// //	مصنوعی طریقۂ تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم	محبوب فروغ احمد قاسمی	۴۷
۱۳۔	تعارف و تبصرہ	''معلم انسانیت کا نظام تعلیم وتربیت''	کمال اختر قاسمی	۵۵
۱۴	روداد	آل یوپی مسابقہ بین المدارس (ملحقہ ندوۃ العلماء)؛ آل اسکولز مقابلہ سائنس و دینیات کوئز (ضلعی سطح)	محمد عالم ندوی	۶۱
۱۵	آخری صفحہ	شریعت میں اعتدال مطلوب ہے	م۔ق۔ن۔	۶۴
۱۶	شعر و ادب	غزل	شعیب احسن اعظمی	

❋ ❋ ❋

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

عالمی یوم خواتین کا فریب اور اردوغان کا بیان

مغرب نے انسانیت کو فریب دینے کے لئے بہت سے نعرے دیے، انسانیت اس کے پرفریب نعروں میں پھنستی گئی اور قعر مذلت میں گرتی گئی، حتی کہ تہذیب جدید انسانیت کو تباہی کے دہانے پر لے آئی، آج اس تہذیب کے گہواروں میں نفرت ہے، عداوت ہے، تنہائی و تجرد کی زنجیریں ہیں، فحاشی ہے، بے حیائی ہے، بلکہ یہ کہیے کہ آنکھوں کا پانی مر چکا ہے، زنا عام ہے، بلکہ زنا تو اس معاشرے میں گناہ ہی نہیں تصور کیا جاتا، اس حیا باختہ تہذیب کی جھلکیاں سڑکوں، پارکوں اور عوامی مقامات (Public Places) پر اس طرح نظر آتی ہیں کہ کتے اور خنزیر بھی شرما جائیں، تہذیب جدید نے تجرد کے رجحان کو فروغ دیا، آزادانہ جنسی تعلقات قائم کرنے کا میلان عام کیا، شادی شدہ مرد و خواتین کو آزادانہ جنسی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دی، باہمی اختلاط اور عورت کی نمائش کے ذریعہ جنسی ہیجان کو گھر گھر اور گلی گلی اس طرح پہنچا دیا کہ ''مہذب'' ملکوں میں پندرہ سالہ بچیاں بغیر نکاح کے حاملہ ہونے لگیں، غور کیجئے تو یہ سب کارفرمائی نظر آئے گی ''تحریک آزادی نسواں'' (Womens Libration Movement) جیسی بے معنی تحریک کی، جس نے عورتوں کو مساوات کا بے بنیاد نعرہ دے کر گھر سے باہر نکالا، مرد کی ہوس کا شکار بنایا، اس کے تقدس کو اوباشوں کا کھلونا بنا دیا، اس کی شرافت کو تار تار کیا، خاندان میں اس کے اعلیٰ مقام کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کر کے اس کو گرمئ محفل کا سامان بنایا، آزادی کے نام پر اسے پھر مرد کی ہوس کے قدموں میں لا ڈالا جہاں وہ اسلام کی آمد سے پہلے پڑی ہوئی تھی۔

اس تحریک نے مساوات کا نعرہ بلند کیا، مساوات کے غیر فطری نعرے کی حقیقت یہ ہے کہ آج تک دنیا کے کسی بھی متمدن ملک میں عورت کو زندگی کے کسی بھی شعبے میں برابری کا درجہ نہ مل سکا، سوویت یونین نے اس سلسلے میں بڑی فیاضی سے قانون بنائے مگر وہاں بھی عورت کا حال وہی ہے جو سو سال پہلے تھا، جاپان میں مرد و عورت کے امتیاز کو ختم کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا گیا جو آج تک نہ پاس ہو سکا، امریکہ میں ۲۰ر خواتین کی ایک ٹیم کی سروے رپورٹ ۱۹۷۲ میں شائع ہوئی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ امریکی عورت آج بھی وہیں ہے جہاں سو سال پہلے تھی، ظاہر ہے کہ مساوات کے اس کھوکھلے اور غیر حقیقی نعرے کے پیچھے تصور تو ''کچھ اور'' تھا، اس کا نظارہ تو نظر آتا ہے مگر مساوات کی مثال نظر نہیں آتی، ذرا کوئی صاحب عقل حکومت، سیاست، تعلیم، انتظام، ریسرچ اور دیگر شعبہائے حیات کا کھلی آنکھوں سے جائزہ لے، اور صرف تہذیب جدید کے علمبردار ممالک کا جائزہ لے، تو اسے اندازہ ہو جائے کہ تحریک آزادی نسواں کے دو سو سال گزرنے کے بعد بھی عورت آج کسی بھی شعبے میں مرد کے برابر کیوں نہیں پہنچ سکی۔

واقعہ یہ ہے دنیا کو یہ فریب دیا گیا کہ عورت و مرد میں جو امتیاز ہے وہ سماجی اور تاریخی ہے، جبکہ حقیقت اس کے برخلاف ہے، تمام آسمانی مذاہب عورت و مرد کو دو الگ الگ صنف مانتے ہیں، دونوں کے کردار، عمل ان کی جسمانی ساخت کے اعتبار سے الگ مانتے ہیں، اب تو جدید تحقیقات خود اس کا دعویٰ کر رہی ہیں کہ مرد و عورت میں امتیاز تاریخی و سماجی نہیں بلکہ حیاتیاتی (Biological) اور تخلیقی و فطری ہے، اسی کے سبب یہ نعرہ اب تک حقیقت نہ بن سکا، کیوں کہ اس امتیاز کی بنیاد وقتی و عملی اور زمانی

اور مکانی نہیں بلکہ فطری اور تخلیقی تھی، اس سلسلے کی پہلی تحقیق ۱۹۳۲ میں لندن سے شائع ہوئی جس کا نام The Biological Tragedy of Women تھا، اس میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا گیا، ایک روسی سائنس داں جو مرد وعورت میں کامل مساوات دیکھنے کا خواہش مند تھا، وہ سارے امتیازات ختم کر دینا چاہتا تھا لیکن مجبور ہو کر اس کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ حیاتیاتی طور پر ہمارے لیے وہ بنیاد ہی نہیں ہے جس سے یہ امتیاز ختم ہو سکے۔

اگر غور کیجئے تو مطلق آزادی نے عورت کو مزید مظلوم بنایا ہے، اس کو جو کچھ ملا ہے اپنی نسوانیت اور اپنے عورت پن کا سودا کر کے ملا ہے، بلکہ بہت سی رپورٹ پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس آزادی اور مساوات کے بے بنیاد نعرے کے سبب عورت جو کچھ حاصل کر سکی ہے وہ بھی اسے مرد کے لئے سامان تفریح بن کر ہی ملا ہے، مختصراً ہم کو یہ کہنے دیجئے کہ عورت پر جس قدر ظلم قدیم مشرکانہ تہذیب نے ڈھایا، جس قدر اس نے اس سے کھیلا، جس قدر اس نے اس کے مقام ومرتبہ کو گرایا، جس قدر اس نے اس کی عصمت کو تار تار کیا اور اسے لاشئہ بے جان بنایا اور بسا اوقات اس کے زندہ وجود کو مٹی کے نیچے دفن کر دیا یا جلا دیا، اس سے کہیں زیادہ عورت کی قدر و قیمت جدید ملحدانہ تہذیب نے گرائی ہے، اس کو چلتی پھرتی لاش بنا دیا ہے، اس کے اندر سے نسوانی حس ختم کر دی ہے، اس کے حسن کو سرِ بازار نیلام کر دیا ہے، اسے ہوس پرستوں کی نگاہوں، زبانوں اور ذہنوں کی عیاشی کا سامان بنا دیا ہے، اگر تعلیم، نوکری اور سماجی عزت اس کی نسوانیت کا سودا کرنے سے، اس کے وجود کو برہنہ کرنے سے، اس کی عصمت کا بھرے بازار میں مذاق اڑانے سے ملے، تو یہ اس متمدن دنیا کا اس قدیم جاہلانہ سماج سے زیادہ اور بھیانک ظلم ہے جس کی چکی میں عورت مسلسل پس رہی ہے، اقبال نے کہا تھا ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اس علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دین سے اگر مدرسۂ زن — ہے عشق ومحبت کے لیے علم وہنر موت

تہذیب جدید کی اس کھوکھلی اور عورت کے وجود کو ختم کرنے والی تحریک آزادی نسواں نے جو کارنامہ انجام دیا ہے، اقبال کے الفاظ میں وہ کچھ اس طرح ہے ؎

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے — روشن ہے نگہ آئینہ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر
آغوشِ صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے — وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر
خلوت میں خودی ہوتی خود گیر و لیکن — خلوت نہیں اب دیر وحرم میں بھی میسر

عالمی یوم خواتین درحقیقت اسی تحریک آزادی نسواں کی مرثیہ خوانی کا دن ہے، اپنے حقوق کو ہوس پرستوں کے بھینٹ چڑھا چکی عورتیں اس دن حقوق نسواں کا مرثیہ پڑھتی ہیں، زندگی بھر آزادی نسواں کے لیے لڑنے والی عورتیں بڑھاپے میں اس دن حقوق نسواں کے لیے احتجاج کرتی ہیں، اپنی جوانی کے ضیاع پر ماتم کرتی ہیں، اپنی بھول، بے بسی، تنہائی اور کسمپرسی کی حالت کا نوحہ کرتی ہیں، اقبال نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ ؎

تمہاری تہذیب خود اپنے خنجر سے خود کشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

آج دنیا نے دیکھ لیا کہ مغرب میں صرف جوان عورت کی قیمت ہے، بوڑھی خواتین کے لیے اولڈ ایج ہوم ہیں، وہ کسی سے بات کرنے کو بھی ترس جاتی ہیں، وہاں کی خاندانی زندگی تباہ و برباد ہو چکی ہے، اولادیں ماں باپ کی شفقتوں سے محروم ہو کر ذہنی مریض اور شقی القلب ہو کر جوان ہوتی ہیں، اسکولوں میں بچوں کے ذریعہ گولیاں چلانے کے واقعات آئے دن اخبارات کی زینت بنتے ہیں، طلاق کے واقعات سب سے زیادہ اسی تہذیب کے متبعین میں پائے جاتے ہیں، کیوں کہ اس تہذیب میں شادی ایک بندھن تصور کی جاتی ہے، اور بندھن میں بندھے رہنا انسانی فطرت کے خلاف ہے، لہذا زیادہ دیر تک وہ بندھن میں نہیں رہ پاتا، مگر جنسی بے راہ روی بہر حال مرد کی غیرت کے خلاف ہے، لہذا آزادانہ اختلاط اس بندھن کے ٹوٹنے کا سبب ہوتا ہے، یہ تحریک جو آج سے تقریبا دو سو سال قبل برطانیہ میں صنعتی انقلاب کے ساتھ شروع ہوئی تھی، ۱۷۹۲ میں اس سلسلے کی پہلی کتاب A vindication of the right of women وہیں سے شائع ہوئی تھی، پھر جہاں جہاں صنعتی انقلاب آتا گیا، یہ تحریک اپنے پاؤں پسارتی گئی، اس تحریک نے سب سے زیادہ حملے بھی اسلام پر کیے، اعتراضات کی بوچھار کی اور دنیا کو یہ دکھانے کی کوشش کی اسلام میں عورت کے حقوق کو دبایا گیا ہے، اس پروپیگنڈے کی بنیاد ایڈورڈ ولیم بنا، جس نے ۱۸۴۳ء میں قرآن کے کچھ منتخب حصوں کا ترجمہ کر کے شائع کیا، اس میں اس نے یہ شگوفہ چھوڑا کہ اسلام کا سب سے کمزور پہلو یہ ہے کہ اس نے عورت کے حقوق کم رکھے ہیں۔

آج عام طور سے عالمی یوم خواتین پر اس پہلو کو زیر بحث لایا جاتا ہے، یوں بھی مسلمان عورت کی مظلومیت موضوع بحث بنی رہتی ہے، آج کل تو ہمارے یہاں عورت کے دشمن بھی مسلم عورت کے ہمدرد بنے ہوئے ہیں، خیر اسلام نے عورت کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا اس پر ہم گفتگو بعد میں کریں گے، پہلے ہم یہاں رجب طیب اردوغان کا وہ بیان پیش کرنا چاہیں گے جس کے لیے ہم نے یہ مضمون لکھا، یورپ کے قلب میں بیٹھا ہوا، یہ حکیم دانا جس حکمت و جرأت کے ساتھ اسلامی مواقف کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا وہ قابل تعریف اور لائق رشک ہے، اس مرتبہ جب سیکولر پسندوں نے عالمی یوم خواتین پر عالمی کانفرنس منعقد کی تو اس سے خطاب کرتے ہوئے اردوغان نے حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کرنے والوں کے دوہرے معیار اور دوغلے پن کو کچھ اس طرح واضح کیا:

''جو ہماری تاریخ و ثقافت میں خواتین اور بچوں پر حملوں کے نشانات تلاش کرتے ہیں وہ در پردہ کچھ اور عزائم رکھتے ہیں، لیکن درست طریقے سے دیکھا جائے تو یہ لوگ خود ہی انسانیت کے خلاف مجرم کہلاتے ہیں، ہماری مائیں دنیا کی سب سے زیادہ خود قربانی دینے والی مائیں ہیں، ہماری خواتین دنیا کی سب سے زیادہ خود قربانی دینے والی خواتین ہیں، انھوں نے ترکی کے ذریعہ خواتین کے حقوق اور دیگر موضوعات پر پیش قدمی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا'' کیا آپ نے کبھی ان لوگوں کو سنا جو خواتین کے حقوق کے لیے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں، کہ انھوں نے گزشتہ چند مہینوں میں مشرقی غوطہ میں سینکڑوں خواتین کی ہلاکت پر بات کی ہو؟ عورتوں کے حقوق کے الفاظ جو وہ بولتے ہیں ان کا کیا مطلب ہوگا اگر وہ ایک لاکھ لوگوں کے بدترین قتل عام کے مجرم کے خلاف زبان نہیں کھولتے، جبکہ ان مقتولین میں زیادہ مقدار خواتین اور بچوں کی ہے''، انھوں نے مزید کہا'' آخر یہ لوگ اس زمین میں کس طرح رہتے ہیں جو اپنے ہاتھ ان خواتین کی مدد کے لئے نہیں بڑھاتے جو کیمپوں میں کسمپرسی کی زندگی گزارتی ہیں، میانمار کے ظلم و ستم سے بچنے کے لئے بہت سی خواتین نے کیمپوں میں پناہ لے رکھی ہے، کیا ان خواتین کے حقوق نہیں ہیں؟ کیا ان عورتوں

کے لیے عورتوں کے حقوق کا نعرہ نہیں دیا جا سکتا جو پچھلی صدی میں بلقان، کاکاشاش اور ترکستان میں مصائب کا شکار رہیں، کیا یہ سب جھوٹ ہے؟''

صدر ترکی رجب طیب اردوغان نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اس طرح کے مزید طنزیہ بیانات سے عالمی یوم خواتین کی حقیقت کو واضح کیا، انھوں نے کہا کہ سال میں ایک دن عالمی یوم خواتین پر حقوق نسواں کی بات کرنے والے منافقت کا شکار ہیں، انھوں نے کہا کہ ہماری خواتین ہماری زندگیوں کا اٹوٹ حصہ ہیں، جس طرح لوگ سال میں ایک دن یوم خواتین مناتے ہیں ہمارے لیے سال کے ۳۶۵ دن بالکل اسی طرح ہیں۔

اردوغان نے اس موقع پر جس طرح حق بیانی کی وہ ان ہی کا حصہ ہے، ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بتدریج فکر کی تبدیلی کو اپنا ہدف بنایا ہے، اسی طرح سے مناسب مواقع پر وہ سیکولرزم کے علمبرداروں کو پُر فریب نعروں کی حقیقت کچھ اس طرح بتاتے ہیں کہ ان کے لیے انکار کرنا دشوار ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ اگر افریقہ کے صحراؤں میں تپتی عورت، روہنگیا کیمپوں میں سسکتی اور بلکتی ہوئی عورت، شام میں اپنے خون کی قربانی دیتی اور اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کھوتی ہوئی عورت کے حقوق پر کوئی سوال کرے، ہندو سماج میں تجرد اور معلق زندگی گزارنے، جہیز کے لیے آگ یا پھانسی کے حوالے کر دیے جانے پر کوئی سوال کرے تو حقوق نسواں کے علمبردار کیا جواب دے سکیں گے۔

درحقیقت حقوق نسواں کی تحریک عورت کو سامان تفریح بنانے، ملکۂ خانہ کو برسرِ عام رسوا کرنے، اہل ہوس کی پیاس بجھانے کے لئے برپا ہوئی، سو اس میں وہ خوب کامیاب ہے، رہے خواتین کے حقوق تو اسلام سے زیادہ یہ حقوق نہ کسی نے عورت کو دیا اور نہ دے سکتا ہے، وجہ صرف ایک ہے کہ عورت کے سلسلہ میں اسلام کا نظریہ جس قدر واضح اور پاکیزہ و باوقار ہے اس قدر کسی اور مذہب میں اس کو حیثیت دی ہی نہیں گئی، اسلام نے عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق دیا، تہذیب وتمدن کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرنے کا حق دیا، معاشرے کی تشکیل میں اس کو سب سے اہم مقام دیا، اظہار رائے کی آزادی کے لیے اسکو زبان ایسی عطا کی کہ خود اللہ نے اس کی بات کو سن کر قرآن کریم میں حکم ظہار نازل فرمایا، اسلام سے پہلے عورت کو زبان کھولنے کیا زبان ہلانے کی بھی اجازت کہاں تھی، اس نے عورت کو مرد کا رفیق قرار دیا، ''پتی دیو'' کے تصور سے اس کو نجات دی، کردار وعمل کے اس کو ایسے مواقع فراہم کیے جو اس کی فکری وجسمانی ساخت اور فطرت کے عین مطابق تھے، اسلام سے پہلے عورت مردوں کے قدموں میں پڑی رہتی تھی مگر اسلام نے عورت کے قدموں میں مرد کی جنت رکھ دی، اسلام نے عورت کو وراثت میں حقوق دیے، نان ونفقات اور کفالت کی ذمہ داریوں سے اس کو بری الذمہ کر دیا اور ساتھ ہی اپنی دولت اسے پسِ انداز کرنے کا اختیار دیا، جبکہ جاہلی معاشرے میں لوگ عورت کی دولت ہڑپ لیا کرتے تھے، اسے بے دست وپا بنا کر بے بس کر دیا کرتے تھے، اسلام نے اس کی کفالت کی ذمہ داری مرد پر عائد کی اور اس کے حصے کی دولت کا مالک اسے بنایا، اسلام ہی تو ہے جس نے عورت کو مرد کی طرح برابر کی ذمہ داری عطا کی اور یہ تصور دیا کہ ہر ایک ذمہ دار ہے، ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک کو اپنی ذمہ داری کا حساب دینا ہے، اسلام میں کسی ایک دن عورت کی تعظیم وتقدیس کے بجائے وعاشروھن بالمعروف کہہ کر اس کو ہمیشہ کے لئے تقدیس وتعظیم اور حسن سلوک کا مستحق قرار دیا گیا، انسانی حیثیت اور کردار وعمل کے لحاظ سے اس کے لیے بھی وہی تمام بشارتیں رکھی گئی ہیں جو ایک مرد کے لیے ہیں، قرآن مجید کا بہت واضح ارشاد ہے، یا ایھا الناس انا خلقنٰکم من ذکر وانثی وجعلنٰکم شعوبا و قبائل

لتعارفوا إن اکرمکم عند الله اتقٰکم إن الله علیمٌ خبیر۔ (سورہ حجرات:۱۳)(ترجمہ:اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو قوموں اور قبیلوں میں تعارف کے لئے تقسیم کیا ہے، تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے خوب باخبر ہے)

اور فرمایا گیا: من عمل صالحا من ذکر أوأنثی وهو مؤمن فلنحیینّه حیاة طیبة ولنجزینهم أجرهم بأحسن ما کانوا یعلمون (سورہ نحل:۹۷)(ترجمہ: جو بھی مرد وزن ایمان کے ساتھ اچھے عمل کریں گے، ہم انھیں حیات طیبہ (خوشگوار زندگی) عطا کریں گے، اور ایسے لوگوں کے اچھے کاموں کی ہم اچھی جزا دیں گے)۔

اور ارشاد فرمایا گیا: فا ستجاب لهم ربهم أنی لا أضیع عمل عامل منکم من ذکر أوانثی بعضکم من بعض (سورہ آل عمران:۱۹۵)(ترجمہ: ان کے رب نے ان کی دعائیں قبول فرمالیں (اور فرمایا) میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کرتا، مرد ہو یا عورت، تم سب کا ایک دوسرے سے تعلق ہے)۔

اسلام میں عورتوں کو مردوں کا رفیق و مددگار قرار دیا گیا ہے، سیرت رسولؐ میں حضرت خدیجہ کی بے مثال رفاقت وتعاون سے اس کی ابتدا ہوتی ہے، تاریخ کا کوئی دور بھی اس حقیقت سے خالی نہیں ملتا جب عظمائے اسلام کی پشت پر کسی عورت کا ہاتھ نہ ہو، کہیں عورت ماں کے روپ میں بیٹے کو ملت کا سپاہی بناتی ہے، کہیں بہن کی شکل میں دین کے لیے بھائی کو مہمیز کرتی ہے، اور بے شمار بیویاں ہیں جو دین کے لیے اپنے شوہروں پر اپنے مال، اپنی خواہشات اور اپنے جذبات کو قربان کر کے مائی خدیجہؓ کے کردار کو زندہ کرتی رہی ہیں، قرآن مجید کا ارشاد ہے: والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض یأمرون بالمعروف وینهون عن المنکر ویقیمون الصلاة ویؤتون الزکوٰة ویطیعون الله ورسوله أولئك سیرحمه الله إن الله عزیز حکیم۔ (سورہ توبہ:۳۱)(ترجمہ: جو مومن مرد ہیں اور جو مومن خواتین ہیں ان کا ایک دوسرے سے ایمانی تعلق ہے، وہ بھلائیوں کے داعی ہیں، اور برائیوں سے روکتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں، اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں، ان پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے گا، بے شک اللہ ہی غالب ہے، صاحب اقتدار ہے، حکمت والا ہے)۔

اسلام مرد وعورت کے تعلقات کو بندھن کا تصور نہیں دیتا، بلکہ ان کو ایک دوسرے کے سکون کا ذریعہ قرار دیتا ہے، ان کے تعلقات کی عمارت محبت، مروت اور باہمی ربط پر کھڑی ہوتی ہے، وہ مرد وعورت کے ملاپ کو نکاح مقدس کا نام دیتا ہے اور اس نکاح کو تعمیر انسانیت اور تشکیل خاندان کا ذریعہ بناتا ہے، قرآن نے مرد وعورت کے تعلق کے لیے ایسی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے جس کا تصور کسی انسانی دماغ میں نہیں آسکتا ہے۔

هن لباس لکم وأنتم لباس لهن علم الله انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم (بقرہ:۱۸۷)(ترجمہ: وہ تمہاری پوشاک ہے تم ان کی پوشاک ہو، اللہ جانتا ہے کہ تم اس کے حکم سے ہٹ کر دل میں خیالات لاتے تھے، اور کبھی غلط قدم اٹھا لیتے تھے، اللہ نے تم پر عنایت فرمائیں اور تمہاری غلطیوں کو معاف کر دیا)۔

باہمی جذبۂ رحم اور باہمی اور اٹوٹ محبت کے اس تعلق کو بیان کرتے ہوئے قرآن مجید نے عورت کو اللہ کی نشانی تک قرار دیا ہے ومن آیاته أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیها وجعل بینکم مؤدة ورحمة إن فی ذلك لآیات لقوم یتفکرون (روم:۲۱)(ترجمہ: اس کی نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہیں میں سے تمہارے لئے جوڑوں (تمہاری

بیویوں) کو وجود عطا کیا، تاکہ تمہیں ان سے راحت حاصل ہو، اور تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی رکھ دی، بے شک اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں)۔

اسلام میں عورت کے تصور اور مقام و منصب کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبال نے کیا خوبصورت بات کہی ہے جو سال میں ایک دن خواتین کو فریب دینے والوں کے لیے نصیحت و عبرت ہے:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ — اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز و دروں
شرف میں بڑھ کر ثریا سے مشتِ خاک اس کی — کہ ہر شرف ہے اس دُرج کا در مکنوں

واقعہ یہ ہے کہ کل عورت سب سے زیادہ مظلوم تھی، جس کو مظالم سے نجات دلانے کے لئے اور اپنے دائرے میں رہتے ہوئے خود مختاری عطا کرنے کے لئے سورۂ نساء نازل ہوئی، اس کے علاوہ جا بجا قرآن مجید نے اس کے وقار کو متعین کرنے کے لئے احکامات نازل کیے، لیکن غور کیجئے کہ تحریک آزادی نسواں کے نتیجے میں آج عورت کل سے زیادہ مظلوم ہے، وہ مردوں کے کام بھی انجام دے رہی ہے اور اپنی ذمہ داریاں نبھانا اس کی ذمہ داری ہے ہی، جس کے نتیجے میں خاندانی نظام پوری طرح منتشر ہو چکا ہے، مغرب اس المیہ سے دوچار ہے، اس کی نقالی کرنے والے بھی اس کشمکش کا شکار ہیں، **عالمی یوم خواتین ان ہی مضطرب لوگوں کو مصنوعی سکون کا سامان فراہم کرنا ہے، عورت کو اشتہارات میں برہنہ کیے جانے کے بعد احترام کا فریب دیتا ہے، اس کی نسوانیت کا گلا گھونٹنے کے بعد اس کو عورت ہونے کا احساس دلاتا ہے، اس کے فطری حقوق کی ترتیب الٹ کر اس کی زندگی اجیرن کر دینے کے بعد اس کے حقوق کی اس دن دہائی دی جاتی ہے۔**

اسلام میں مرد و عورت کے لئے تقسیم کار پر عمل کیا گیا ہے، اس سلسلے میں دونوں کی فطرت اور جسمانی ساخت کی مکمل رعایت کی گئی ہے، گھر میں عورت کا جو مقام ہے ہزار کوششوں کے بعد بھی آج تک مغرب اس کو کم نہ کر سکا، بلکہ اب تو پھر سے تحریک آزادی نسواں سے قبل کے دور میں واپس جانے کی کوشش کر رہا ہے، اعتراف ناکامی کے ہزاروں دستاویزی ثبوت موجود ہیں، جن سے یہ عبرت حاصل ہوتی ہے کہ فطرت کے اصولوں سے بغاوت کا انجام بہت بھیانک ہے، مرد کے کام عورت نہیں کر سکتی اور عورت کے فرائض مرد انجام نہیں دے سکتا، بغرض ضرورت دونوں ایک دوسرے کے کام انجام دیا کرتے ہیں، لیکن ضرورت کا تعین اپنی خواہش پر نہیں ہوتا، اس لیے کہ خواہشات خود ایک صنم ہیں خواہشات پرستی صنم پرستی ہے، ضرورت کو شریعت کے معیار پر پرکھا جائے گا اور پھر ضرورت کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہوگی، عہد صحابہ سے لے کر آخر تک اس کی مثالیں موجود ہیں، ۱۹۱۲ میں طرابلس کی جنگ میں مجاہدین کو پانی پلاتے ہوئے جب فاطمہ نامی دوشیزہ نے جام شہادت نوش کیا تو اقبال نے بڑی انقلابی نظم کہی تھی، جس کا مطلع یوں ہے ؎

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

اسلام خواتین کو درحقیقت یہ تعلیم دیتا ہے: وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولىٰ وأقمن الصلاة و آيتن الزكوة وأطعن الله ورسوله (سورہ احزاب:۳۳) (ترجمہ: اور اپنے گھروں میں رہو، اور پہلے دور کی جاہلیت کے فیشن مت اختیار کرنا اور نمازوں کا اہتمام کرو اور زکوۃ ادا کیا کرو، اور اللہ اور اس کے رسول کی بات مانا کرو)۔

لیکن پھر ان الفاظ میں جناب رسالت مآب ضرورت کے لیے باہر نکلنے کی رہنمائی فرماتے ہیں:

قد أذن الله لكن أن تخرجن لحوائجكن (فتح الباری، کتاب النکاح، باب خروج النساء لحوائجھن، رقم الحدیث ۵۲۳۷، دار الحدیث القاھرہ، سنہ طبع ۲۰۰۴ء)

پھر اللہ تعالیٰ تشریف عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کا یہ سلیقہ سکھاتے ہیں:

يـا أيهـا الـنبى قل لأزواجك وبناتك ونساء المومنين يدنين عليهن من جلابيبهن ذلك ادنى ان يعرفن فلا يؤذين وكان الله غفورا رحيما (احزاب:۵۹) (ترجمہ: اے نبی! اپنی بیویوں اور اپنی بیٹیوں اور ایمان والوں کی خواتین سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادروں کو اپنے اوپر ڈال لیا کریں، یہ اس کے زیادہ قرین قیاس ہے کہ وہ پہنچان لی جائیں (کہ پردہ کر لینے والی حیادار خواتین ہیں) اور انھیں کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائیں، اور اللہ مغفرت فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے)۔

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جس پردہ کو دقیانوسیت اور عورت پر ظلم اور اس کی ترقی کے لئے عارض و مانع قرار دیا جا رہا ہے وہ پردہ اس کے تحفظ Protection اس کی عصمت وعفت کی حفاظت کا ذریعہ اور اس کی شرافت ونجابت کی علامت ہے، مدینہ منورہ میں منافقین ایسی بہت سی حرکتیں کرتے تھے جو رسول اللہؐ کی ایذا رسانی اور مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث بنتی تھیں، کبھی وہ سازشیں کرتے، کسی مسلمان کو دیکھ کر آپس میں سرگوشی کرتے، مذاق اڑاتے، منجملہ ان حرکتوں کے وہ مسلم خواتین پر جملے کستے، چھیڑ خوانی کرتے، شریف گھرانوں کی عورتوں کی طرف انھیں نظر اٹھانے اور انھیں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی، مسلمان باندیوں اور کنیزوں کے ساتھ ان کا یہ سلوک ہوتا تھا، لیکن کبھی باندیوں کے شبہ میں میں شریف عورتوں پر بھی زبان دراز کر دیا کرتے، چنانچہ حکم الٰہی آیا کہ شریف عورتیں حجاب کے ساتھ نکلا کریں، یہ حجاب ان کی شرافت ونجابت، خاندانی وجاہت اور عفت و پاکدامنی کو پہچان لینے کا ذریعہ ہے، آج کے اس گئے گزرے دور کا بھی یہ مشاہدہ ہے کہ واقعی کوئی باپردہ خاتون نکلتی ہے تو لوگ بلکہ اوباش بھی اس سے چھیڑ خوانی نہیں کرتے الا یہ کہ کسی انتہائی سرکش شیطان سے ٹکراؤ ہو جائے، (واقعی اس لیے کہ کہ آج کل نقاب خود فیشن اور کشش کا ایک ذریعہ کچھ اس طرح بنتا جا رہا ہے کہ نقاب و بے نقابی میں کچھ فرق نہیں رہ گیا)۔

یہاں اس سے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں ورنہ ہم مطلق آزادی نسواں کے فریب کا پردہ چاک کرنے کے لئے مغربی خواتین کی کچھ المناک داستانیں نقل کرتے اور موجودہ مغربی عورت کی کربناک حالت پر اسی کے اعترافات درج کرتے، یہاں اختتام سے قبل بس یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ جس طرح ہم نے ایک عرصہ سے ہر شعبہ اور ہر میدان میں دفاعی پالیسی اختیار کی ہے، اسی طرح حقوق نسواں کی بابت بھی ہم ہمیشہ اسلام میں عورت کے حقوق کے خلاف پروپیگنڈوں کا دفاع کرتے رہے ہیں اس کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں:

۱۔ عملاً ہمارے معاشرے میں خواتین کے حقوق کو لے کر وہ بیداری نہیں پائی جاتی جس کا مطالبہ اسلام نے کیا۔

۲۔ خواتین کی تربیت کے لئے ہمارے یہاں کوئی معقول انتظام نہیں، جو انتظامات بآسانی ہو سکتے ہیں ان سے بھی وہ محروم ہی رہتی ہیں خواہ اس کی توجیہات جو بھی کی جائیں، سب سے زیادہ آسان کام مسجد کی دینی ماحول اور دینی تربیت سے جوڑنا تھا، تو اولاً اس میں جو تحفظات ہیں ان کے متعلق کبھی سوچا نہیں گیا، ثانیاً ہماری مساجد بھی تربیت کا مطلوب نظام اب کہاں رکھتی ہیں، البتہ جمعہ و جمات از خود ایک انقلابی پیغام کا حامل نظام ہے۔

۳۔ ہمارے یہاں مسلکی تشدد کو جو مقام حاصل ہے وہ کہیں نہ کہیں شریعت کی تشریح وتفہیم کی راہ میں رکاوٹ بنا

ہے، اسی لیے ہم برادران وطن کو خواتین سے متعلق اسلام کے قوانین رحمت سے خاطر خواہ متعارف نہیں کرا سکے۔

۴۔ ہم نے ہمیشہ دفاعی گفتگو کی، کبھی بڑھ کر معترضین کی تہذیب کے دوغلے پن کو موضوع نہیں بنایا اور جن مصنفین نے یہ مبارک کوشش کی ہماری تنگ نظری نے ان کا دائرہ افادیت کم کر دیا اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش تک نہ کی۔

اس وقت سخت ضرورت ہے کہ آگے بڑھ کر دیگر تہذیبوں بالخصوص مغرب کی ملحدانہ تہذیب اور اس کی آزادی نسواں کی تحریک کے مہلک نتائج کو بیان کیا جائے، اس کے دوغلے پن کو اس طرح بے نقاب کیا جائے جس طرح اردوغان نے یہ کام کیا اور ایک طاقتور پیغام دیا، عملی طور پر اپنے خاندان اور معاشرے میں خواتین کے حقوق کو اسلامی نظریہ کے مطابق رواج دیا جائے تاکہ اسلامی نقطۂ نظر کی عملی تصویر پیش کی جا سکے، اس سلسلے میں سب سے اہم کردار ان اسکولوں کے مالکان کا ہے جو مسلمان ہو کر بھی مخلوط تعلیم کا نظام قائم کیے ہوئے ہیں، اس راستے سے وہ بے حیائی اور آزادانہ اختلاط (Mixing) کی راہ ہموار کر رہے ہیں، ان کو اپنے اس جرم سے توبہ کرتے ہوئے اور مغرب و امریکہ کی دم توڑتی تہذیب سے عبرت حاصل کرتے ہوئے مخلوط تعلیم (Co-education) کی جگہ علحدہ تعلیم کا انتظام کرنا چاہیے اور دنیا کو بتانا چاہیے کہ اسلام نے یقیناً آزادی کا تصور دیا ہے مگر وہ خودمختاری کے ساتھ اطاعت سے شروع ہو کر عبادت پر ختم ہوتا ہے، انسان کے سامنے اچھائی اور برائی کی وضاحت کر دی گئی ہے، پھر دونوں میں سے کسی کے ایک اختیار کرنے کے لیے آزادی دی گئی ہے، دونوں کے نتائج اور انجام سے باخبر کر دیا گیا ہے، اور پھر قطعی وحتمی طور پر یہ تصور دیا گیا ہے قل إن صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی لله رب العالمین، (سورہ انعام:۱۶۲) (ترجمہ: اور (یہ بھی) کہہ دیجئے کہ میری نماز، اور میری قربانی اور میری زندگی، اور میری موت سب اللہ کے لئے ہے، جو سب کا مالک و پروردگار ہے)۔

اس لیے پوری قوت سے آزادی نسواں Libration of women کا نعرہ لگانے والوں کو یہ بتانا چاہیے کہ اسلام نے عورت کو جو آزادی دی ہے اس سے زیادہ کسی مذہب میں نہیں دی گئی، خواتین اسلام کے سنہرے کارنامے اس پر شاہد ہیں، البتہ اسلام نے عورت کی آزادی کی ایک حد متعین کر دی ہے کہ وہ معاشرتی، سماجی، تعلیمی، تہذیبی وتمدنی میدان میں ترقی کی اعلیٰ سے اعلیٰ منازل طے کر سکتی ہے مگر اس کو مرد بننے کی اجازت نہیں ہے، یہ کام اس کو عورت رہتے ہوئے ہی کرنا پڑے گا، اسلام نے آزادی کو فرمانبرداری libration through submission کے ساتھ مشروط کر دیا ہے۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ شام کا ماتم

سقوط حلب کے بعد سقوط غوطہ دمشق

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

مسلمانوں کو آنحضرت ﷺ نے تعلیم دی ہے کہ وہ مسلمان بھائیوں کے مسائل سے واقف رہنے کا پورا اہتمام کریں یہاں تک کہ ایک حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص مسلمانوں کے امور سے واقف نہ ہو اور ان کی پریشانیوں کو دور کرنے کا اہتمام نہ کرے وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ اس حدیث کا تقاضہ ہے کہ ہم اپنے شامی بھائیوں کے مصائب کے بارے میں جانیں اور جو ممکن ہو اس سے دریغ نہ کریں۔ ملک شام سے وابستگی کا حکم بھی ہے حدیث میں حکم ہے " علیکم بالشام "یعنی ملک شام سے تمہارا خصوصی تعلق ہونا چاہئے۔ پھر ملک شام کے بارے میں آپ نے فرمایا "یجتبی الیھا خیرتہ من عبادہ "یعنی اللہ کے بہترین بندے اس سرزمین کے لئے چنے جاتے ہیں۔ آج اگر احساس کی شدت موجود ہے تو ہزاروں میل کی دوری سے مظلومین شام کا یہ نوحہ غم جو کبھی بیوہ کی زبان سے اور کبھی یتیم کی زبان سے یا اور کسی محزون وغم نصیب کی صدا بن کر بلند ہوتا ہے ہمارے کانوں تک پہونچ سکتا ہے "غم کا فسانہ کس کو سنائیں۔ ٹوٹا ہوا دل کس کو دکھائیں" اور "اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے"

حدیث نبوی کے مطابق دنیا کے تمام مسلمان ایک جسد واحد کے مانند ہیں اگر کسی ایک عضو کو کوئی تکلیف پہونچتی ہے تو سارا جسم بخار اور درد سے تڑپتا ہے۔ آج ہم مسلمانوں کا دل بہت غمزدہ ہے، آج شامی مسلمانون کی تکلیف سے اور غم سے سارے مسلمان غم زدہ ہیں۔ دنیا میں بہت سے خطہ ارض ہیں جہاں قتل وغارتگری کا بازار گرم ہوتا ہے لیکن پھر یہ قتل وغارتگری ایک دن رک جاتی ہے لیکن ایک سرزمین ایسی ہے جہاں خون ریزی رکنے کا نام نہیں لیتی ہے، دن گذر جاتے ہیں ہفتے اور مہینے اور برس گذر جاتے ہیں خون کی پیاس نہیں بجھتی ہے، قاتل کا دست سفاک قتل سے باز نہیں آتا ہے۔ پہلے درعا پھر دیرالزور پھر حلب اور اب غوطہ دمشق، پہلے بھی جان بچانے کے لئے لوگ سمندروں میں کود گئے تھے اور پھر کشتیاں پانی میں ڈوب گئی تھیں ایلان کردی جیسے بچوں کی لاشیں انسانیت کو پکارتی رہیں، پھر حلب میں ملبے کے نیچے دبا ہوا بچہ احمد اپنی معصومیت کے ساتھ آوازیں دیتا رہا۔ تقریباً سات سالہ جنگ میں پچاس ہزار سے زیادہ معصوم بچے مارے گئے۔ اب پھر وہی شام ہے، وہی شبخون ہے اور وہی خوں آشامی ہے، غوطہ دمشق میں ظلم وتشدد کا طوفان ہے ہر شخص لہولہان ہے، سکونتی عمارتیں مسمار ہو گئی ہیں مسجدیں شہید ہوگئی ہیں اسپتال منہدم ہو گئے ہیں اس بار غوطہ دمشق میں خون کی ندی میں مظلوم شامی مسلمان غوطہ زن ہیں شام کے کماندار ناوک فگن ہیں اور حاکم شام کے فوجی کھلے آسمان سے بمباری کر کے سیکڑوں معصوم انسانوں کی زندگی کا چراغ بجھا رہے ہیں۔ غم کا فسانہ روز وشبانہ ہے، یہ سلسلہ ۲۰۱۱ سے شروع ہوا

ورر کنے کا نام نہیں لیتا ہے۔ گذشتہ چند روز کے اندر غوطہ دمشق میں ۱۱۸۰۰ اشخاص کی زندگی کا چراغ گل ہو چکا ہے ۸ لاکھ اشخاص سیر یا میں ظالم بشار الاسد اور اس کے حلیفوں کے ہاتھ سے شہید ہو چکے ہیں اور ایک کروڑ چالیس لاکھ سے زیادہ ہجرت کر چکے ہیں اب تک لاکھوں زندگیاں ایک حکمراں کی ضد اور رعونت کے آگے قربان ہو چکی ہیں اور لاکھوں انسان اپنا گھر بار اپنی تجارت اور ملازمت چھوڑ کر افتاں وخیزاں لرزاں اور ترساں، چاک گریباں خوں بداماں راہ فرار اختیار کر چکے ہیں اب نہ ان کا کوئی گھر ہے نہ در ہے نہ آشیانہ ہے بس سر کے اوپر خیموں کا سائبان ہے جو پڑوسی ملک ترکی نے اپنے یہاں مہیا کر دیا ہے۔

دنیا میں بدی اور خباثت کی سب سے بڑی علامت بشار الاسد ہے جس کی فوج ہر طرف ملک میں رقص بسمل کا تماشہ دکھا کر اب غوطہ دمشق میں عمارت شکن اور زمین شگاف بمباری میں مصروف ہے جس میں ہر روز سیکڑوں مرد اور عورتیں اور بچے لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ قیامت سے پہلے قیامت کا منظر ہے، دھماکوں اور شل باری سے زمین پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے، بموں کا دھواں آسمان تک بلند ہو رہا ہے، عمارتیں تاش کے پتے کی طرح زمین بوس ہو رہی ہیں، غوطہ دمشق ایک ملبہ سے تبدیل ہو رہا ہے اور اس کے بڑے حصہ پر اب شامی فوج کا قبضہ ہو رہا ہے، روسی مشیر کار بھی بشار کی رہنمائی اور کمک کے لئے برسر موقعہ موجود ہیں، دنیا میں مختلف تنظیمیں اس ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں لیکن عرب دنیا کی طرف سے احتجاج کی کوئی آواز بلند نہیں ہوتی ہے، جیسے شامی ان کے بھائی نہ ہوں دشمن ہوں، اقوام متحدہ نے ایک ماہ کی جنگ بندی کی قرارداد منظور کی ہے لیکن اس پر عمل درآمد ندارد، بعض طاقتیں روس سے مداخلت کی اپیل کر رہی ہیں۔ میر کی سادگی بھی ضرب المثل ہوگئی ہے ''میر کیا سادہ ہیں...''

ان جاں گسل حالات میں غیرت سے عاری اور حمیت سے خالی بعض مسلم عرب ملک ہیں جو سیریا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے بس تماشہ بیں ہیں، اور ان میں بعض حکمران ہیں جو بت خانے کی تعمیر میں لگے ہوئے ہیں، یا وہ ملک ہیں جو مقدس سرزمین کے تقدس کی پرواہ کئے بغیر تین سو سینما ہاوس کی تعمیر کا ''عظیم الشان'' منصوبہ رکھتے ہیں اور امریکی کلچر کو درآمد کرنا چاہتے ہیں اور اپنے شبستان عیش میں اپنی دولت سے داد عیش دے رہے ہیں۔ غوطہ کے مظالم پر خلیجی تعاون کونسل یا عرب لیگ کی طرف سے مذمت کا کوئی بیان بھی ابھی تک نہیں آیا ہے، ایسا لگتا ہے کہ خون خشک ہو گیا ہے یا خون پانی بن گیا ہے، حالانکہ انسان وہ ہے جس کے اندر انسانیت کا درد پایا جائے، جو سب کے غم کو اپنا غم بنائے اور جو مسلمان ہوتے ہوئے مسلمانوں پر ظلم دیکھے اور اس پر وہ نہ تڑپے وہ مسلمان نہیں ہے حدیث میں ہے جو مسلمان مسلمانوں کے معاملات کا اہتمام نہ کرے اور پریشانیوں کو دور کرنے کی فکر نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔ یہ عرب حکمراں بے حس ہیں، بے ضمیر ہیں اور اس لائق نہیں ہیں کہ حکمرانی کریں، کیا انہوں نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی وما لکم لا تقاتلوں فی سبیل اللہ والمنستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من هذه القرية الظالم اهلها واجعل لنا من لدنك وليا واجعل لنا من لدنك نصيرا (النساء ۷۵) ترجمہ: کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا دئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی اور مددگار پیدا کر دے۔

شام اس وقت ایک ایسے جسم کے مانند ہے جس کے اعضاء کٹے

ہوئے اور بکھرے ہوئے ہیں، اس کے جسم کو مشلہ کرنے میں تمام بڑی طاقتیں اور چھوٹی طاقتیں شریک ہیں۔شام کے مزاحمتی گروپ جس میں اسلام پسند بھی شامل ہیں، اس کو توڑنے میں ترکی کے سوا سب متحد ہیں، حلب ہو یا درعا حمص ہو یا دیرالزور یا غوطہ دمشق ہر جگہ زمین خون مسلم سے لالہ زار ہے، سقوط شام پر عرب اسلامی دنیا میں سکوت صبح وشام طاری ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان عرب مسلم ملکوں پر مرگ غیرت اور مرگ حمیت اور مرگ دوام طاری ہے، کچھ خیر وخیرات کے اچھے کاموں کے باوجود یہ اچھی حکومتیں ہرگز نہیں ہیں۔اگر شام میں آبادی بجائے مسلمانوں کے عیسائیوں کی ہوتی اور ان کے ساتھ یہ خون ریزی اور خون آشامی کا معاملہ ہوتا تو دنیا چیخ پڑتی، شام کی جنگ کے تمام فریق، مسلمان مجاہدین مزاحمتی گروپ اور ترکی کو چھوڑ کر، سب خوش ہیں کہ اسلام کا نام لئے بغیر مسلمانوں کے جسم کی تکابوٹی کی جارہی ہے۔اور ان بڑی طاقتوں کو خوب معلوم ہے کہ پڑوس کے عرب ملک بے طاقت اور بے حیثیت ہیں وہ کچھ نہیں کرسکتے، وہ عشرت کدوں میں داد عیش دینے کے سوا کچھ نہیں جانتے، جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن وہ یہی عرب ہیں، صلاح الدین ایوبی کی قبر بھی دمشق میں ہے اور صلیبی طاقتوں کو صلیبی جنگ، کا حوالہ دئے بغیر صلاح الدین ایوبی سے بدلہ لینے کا موقعہ ہاتھ آیا ہے، مسجد اقصی صلیبیوں کے قبضہ میں ہے اور اب یروشلم میں امریکہ کا سفارت خانہ جلد ہی کھلنے والا ہے، عیسائی دنیا بیت المقدس مقدونیہ اور قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا قبضہ کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔عیسائی دنیا چاہتی ہے کہ پوری دنیا شورِ ناقوسِ کلیسا سے گونج اٹھے اور نغمہ توحید اور گلبانگ اذاں کہیں سنائی نہ دے، اسے مسلمانوں سے انتقام لینا ہے اور پایان کار مرغان حرم کے سب سے مقدس آشیانہ پر قبضہ کرنا ہے، خادم الحرمین کو اس کی خبر نہیں۔بے ید بیضاء ہے پیران حرم کی آستیں۔

شام وہ بدقسمت ملک ہے جس میں ایک نہیں ظلم وستم کے خونیں پنجے بہت سے ہیں، داعش کو ختم کرنے کے نام پر روس اور امریکہ دونوں مسلسل شہری علاقوں پر بم باری کرکے عمارتوں کو منہدم کرتے رہے ہیں، مسجدوں اور اسپتالوں تک کو نشانہ بنایا گیا ہے اور ان دونوں آقاؤں کی فضائی سرپرستی میں بشارالاسد کی فوج فتح کا جھنڈا بلند کرتی رہی ہے، ایران کی آرمی بشار کی فوج کے ساتھ لڑتی رہی ہے حزب اللہ نے بھی بشار کی مدد کرنے میں کوتاہی نہیں برتی ہے۔یہ سب طاقتیں مل کر خون کی ہولی کھیلتی رہی ہیں بالکل ابتدا میں جب یہ بیرونی طاقتیں میدان میں نہیں کودی تھیں شام کے مجاہدین نے جنہیں باغی کہا جاتا ہے ملک کے اسی فی صدی علاقوں پر زمینی قبضہ کرلیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ پورے ملک شام پر باغیوں کا قبضہ اب چند روز کی بات ہے، اور اسلامی فکر اور جذبہ سے سرشار باغی ملک کے دروبست پر قبضہ کرلیں گے، یہ اسرائیل اور بڑی طاقتوں کے لئے ناقابل برداشت بات تھی اور اسرائیل کا وجود خطرہ میں پڑسکتا تھا، بشارالاسد کے ظالمانہ رویہ کے باوجود دنیا کی طاقتیں اسی پیکر ظلم حاکم کو برسراقتدار دیکھنا چاہتی تھیں اور ایران کے نزدیک ایک شیعی اقتدار خواہ وہ کیسا ہی برا ہو سنی اقتدار سے بہتر ہے، ایران کی یہی شیعی توسیع پسندانہ پالیسی شام کے علاوہ عراق میں یمن میں بحرین میں ہر جگہ جاری ہے، اس کا تقریب بین المذاہب کا نعرہ مکر وفریب کے ایک جال کے سوا کچھ نہیں، ایران کے بعد روس اور امریکہ سب شام کے تالاب میں مچھلیوں کے شکار کے لئے کود پڑے، اس کے بعد جنگ کا منظر نامہ بدل گیا، حقیقت یہ ہے کہ شام میں اپوزیشن کو بشار سے شکست نہیں ہوئی ہے بلکہ بین الاقوامی طاقتوں سے شکست ہوئی ہے ورنہ بشار کو ناکوں چنے چبوانے کے لئے حریت پسند مزاحمتی گروپ کافی تھے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں کہ جب طاقت نہیں تھی تو مزاحمتی گروپ کو بشار کے خلاف نہیں اٹھنا

چاہئے تھا۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ دراصل ہر مزاحمت کے مخالف ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر یزید کے خلاف حضرت حسین کے اقدام کو بھی غلط سمجھتے ہیں۔

مشرق وسطی پٹرول کی دولت سے مالا مال ہے اور اس میں فلسطین جیسا ملک بھی ہے، جس کا تاریخی طور پر تعلق دنیا کے بڑے مذاہب سے رہا ہے اس لئے دنیا کی قوموں کی حریصانہ نگاہیں اس سرزمیں پر لگی ہوئی ہیں اور بہت زمانہ سے اپنا پنجہ حرص اس میں پیوست رکھنا چاہتی ہیں، ترکی کے مرد بیمار کو توڑنے کی کوشش یورپ نے بہت پہلے شروع کردی تھی، ترکی نے قسطنطنیہ اور بعد میں مشرقی یورپ پر قبضہ کرلیا تھا، اس کے انتقام کی آگ میں یورپ زمانہ دراز سے جلتا رہا تھا، یہ ''حادثہ'' اس کے دل کا داغ اور سینہ کا چراغ بن گیا تھا، اس کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ اسلام کا علم بردار کوئی ملک، رومن امپائر اور عیسائیت کے سب سے بڑے مشرقی مرکز قسطنطنیہ پر قبضہ کرلے، یورپ کو ترکی سے انتقام لینا تھا اور صلیبی جنگوں میں شکست کا بدلہ بھی لینا تھا۔ اس نے والی حجاز شریف مکہ کو ورغلایا کہ اگر وہ ترکی کے خلاف بغاوت کرلے تو جزیرہ نمائے عرب (موجودہ سعودی عرب) کے علاوہ عراق وشام وفلسطین کا اسے تاجدار بادشاہ بنادیا جائے گا، یہ شریف مکہ جو صرف نام ونسب کا حجازی تھا، یورپ کے دام میں آ گیا ترکوں کے خلاف بغاوت کی آگ بلند ہوئی تو موقعہ پاتے ہی مغربی طاقتوں نے عراق وشام وفلسطین اور اردن پر قبضہ کرلیا اور ترکی کو اقتدار سے بے دخل کردیا۔ منہ بھرائی کے طور پر عراق اور اردن شریف مکہ کے بیٹوں کو دئے گئے اور پھر بندر بانٹ میں فلسطین برطانیہ کو ملا اور شام فرانس کو دیا گیا، تاریخ بتاتی ہے کہ ظلم واستبداد کے خلاف کھڑا ہونا مسلمانوں کے سرشت میں داخل ہے، وہ طویل عرصہ تک ظلم برداشت نہیں کرسکتے ہیں، چنانچہ مسلمانوں نے فرانسیسی استعمار کے خلاف بغاوت کی، فرانس نے اپنی عسکری طاقت سے مسلمانوں کو دبایا اور کچلا، لیکن ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم میں برطانیہ اور فرانس کی عسکری قوت کو شکست دی تھی اور پھر فرانس کے کمزور ہوتے ہی ۱۹۴۷ میں شام فرانس کے قبضہ سے آزاد ہوگیا، اور جنگ آزادی کے لیڈر شکری القوتلی شام کے پہلے صدر بنے، شکر القوتلی کے باغیانہ تیور اور بڑی طاقتوں کے خلاف ان کے انداز مبارزت طلبی سے امریکہ سخت برہم ہوا اور پھر امریکہ کے سفارت خانہ نے وہ رول ادا کیا جو وہ ہر جگہ دنیا میں ادا کرتا رہا ہے، چنانچہ شام میں ۱۹۴۹ میں فوجی بغاوت ہوئی اور علوی شیعہ چونکہ فوج میں کافی تعداد میں تھے، ان کی مدد سے علوی حافظ الاسد نے اقتدار پر قبضہ کرلیا اور شکری القوتلی برطرف کردئے گئے اور پھر حافظ الاسد نے اپنے خاندان اور کنبہ والوں کو اور علویوں کو حکومت میں بڑے بڑے عہدے دئے اور گویا خاندانی اور مسلکی حکومت قائم کرلی، اپنے مخالفوں کو، سنیوں کو اور دینِ اسلام کے نفاذ کے علم برداروں کو پوری طاقت سے کچلا، چالیس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا گیا، انہوں نے شام میں اپنی وہ حیثیت بنائی جو لیبیا میں کرنل قذافی کی تھی، لیبیا میں بھی قذافی سے اختلاف رکھنے والوں کو بیدردی سے ختم کردیا جاتا تھا اور ''الکتاب الاخضر'' کو آسمانی صحیفہ کی حیثیت دے دی گئی تھی، عرب دنیا کی تاریخ کی یہ پہلی فوجی بغاوت تھی اور علوی فرقہ ملک کے تمام دروبست پر قابض ہوگیا۔

قرآن کے حکم کے رو سے شام کے مسلمانوں کی مدد مسلمانوں پر واجب ہے جس طرح اہل فلسطین کی مدد واجب ہے۔ شام میں جن لوگوں کے ہاتھ میں انقلاب کی قیادت تھی ان کی ذہنی اور فکری وابستگی اخوان المسلمون کے ساتھ تھی اور خلیج کے حکمرانوں کا حال یہ ہے کہ انہیں لفظ اخوان کے الف سے بھی ڈر لگتا ہے، وہ اخوان فوبیا میں گرفتار ہیں اور اسی لئے انہوں نے محمد مرسی کی حکومت کا تختہ

الٹنے میں بڑی طاقتوں کی پوری مدد کی، خلیجی حکومتوں کے حاکموں کے کفش بردار مفتی حضرات اخوان پر اور ان تمام علماء پر جو اخوان کے طرفدار تھے دہشت گردی کا الزام لگاتے رہے، علم دین اور افتاء کی ایسی رسوائی چشم فلک نے کم دیکھی ہوگی، کہا جاتا ہے کہ مسلم عرب ملکوں کو بڑی طاقتوں کا خوف ہے اس لئے وہ شام کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے، یہاں سوال یہ ہے کہ آپ شمالی کوریا کی طرح بڑی طاقت کیوں نہیں بن سکے پٹروڈالر اور سیال سونا آپ کو دیا گیا تھا آپ نے اس کا مصرف کیوں نہیں لیا، آپ نے سائنس اور ٹکنولوجی میں ترقی کیوں نہیں کی، اور کیوں پوری قوم کو صارفین Consumers کی قوم بنا دیا، کیا قرآن میں یہ حکم نہیں ہے کہ تمہارے پاس ایسے اسلحہ ہوں کہ دین اسلام کے دشمن اور تمہارے دشمن (آج کے زمانہ میں اسرائیل اور امریکہ وغیرہ) خوف سے لرزہ براندام ہو جائیں، تصور کیجئے کہ شام کے پڑوسی عرب ملکوں میں کوئی ملک اگر اسرائیل یا مغربی ملکوں کی طرح طاقتور ہوتا تو کیا بشار کو یہ جرأت ہوتی کہ ڈکٹیٹر بن کر شامی مسلمانوں پر ظلم کرے یا کیا ایران کو ہمت ہوتی کہ وہ بشار کا حلیف بن کر سنی مسلمانوں پر ظلم ڈھائے یا کیا روس کی ہمت ہوتی کہ شام کے معصوموں پر بمباری کرے، کیا یہ خلیجی ملکوں کا جرم نہیں ہے کہ وہ پٹرول کی دولت سے صرف عیش کرتے ہیں اور اپنے ملک کو صنعتی اعتبار سے طاقتور نہیں بناتے ہیں۔ اگر وہاں کے باشعور مسلمان حکومت کے خلاف کھڑے ہو جائیں اور حکومت کو بدلنے کی کوشش کریں تو ان کو قصور وار نہیں ٹھرایا جا سکتا کیونکہ وہاں کے حاکموں نے قرآن کے حکم کو پامال کیا ہے، آج خلیجی ملکوں کا ایک ولی عہد سلطنت ترکی کو جس نے شامیوں کی مدد کی ہے بدی کا محور قرار دیتا ہے، وہ شخص قرار دیتا ہے جو سرزمین مقدس کو بدی کی آماج گاہ بنانے پر تلا ہوا ہے، وہاں کے بڑے مفتی سے لے کر چھوٹے مفتی تک سب کی زبانیں خاموش ہیں، منبر و محراب حق گوئی کے لئے ترس رہے ہیں۔

شام بحیرۂ روم کے مشرقی کنارے پر واقع ایک بے حد خوبصورت اور شاداب ملک ہے اس کے مغرب میں لبنان اور شمال میں ترکی ہے اور مشرق میں عراق ہے اور جنوب میں اردن واقع ہے یہ دو کروڑ کی آبادی کا ملک ہے اس میں ۹۰ فی صد سے زیادہ مسلمان ہیں غالب اکثریت سنیوں کی ہے، لوگ خلیجی ملکوں کی طرح امیر نہیں ہیں کیونکہ پٹرول کی پیداوار کم ہے، لیکن ان کے معاشرتی اخلاق بہت بہتر ہیں، ان میں شرافت ہے اور دلجوئی اور دلنوازی ہے، فرانس کے اقتدار کے ختم ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد حافظ الاسد نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا جو علوی شیعہ تھا اور فوج میں ملازم تھا چونکہ فوج میں علویوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے اس نے بزور طاقت اقتدار پر قبضہ کر لیا اور دینی ذہن رکھنے والوں اور اخوان کو کچلنا شروع کیا، اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا تخت اقتدار پر بیٹھا اور اس نے باپ سے زیادہ ظلم کئے، پورے ملک میں ایمرجنسی جیسی حالت ہمیشہ رہی، کسی کو تحریر و تقریر کی اجازت نہیں تھی، یہاں تک کہ سیرت کے جلسے بھی بند مکانوں میں منعقد ہوتے تھے، بہار عرب کی جب ابتدا ہوئی اور تیونس میں انقلاب آیا اسی وقت شام میں بشار الاسد کے مظالم کے خلاف ۱۵ مارچ ۲۰۱۱ء کو مظاہرے شروع ہوئے، اس وقت شام میں جمہوری اصلاحات اور اقتصادی حقوق کے مطالبے تھے اس آواز کو بشار نے آہنی ہاتھوں سے کچل دیا، پھر پورے ملک میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور طاقت سے ان پرامن مظاہروں کو روکنے کی وجہ سے بغاوت کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، پھر وہ وقت آیا کہ ملک کی سرزمین کا ۸۰ فی صد حصہ بشار کے قبضہ سے نکل کر باغیوں کے قبضہ میں چلا گیا، جن کی قیادت کرنے والوں میں دینی ذہن کے لوگ اور اخوان المسلمون کے لیڈر تھے، امریکہ اور اسرائیل دونوں

خوف کی نفسیات میں مبتلا تھے، چونکہ شام روس کا حلیف تھا اس لئے بھی وہ بشار کا مخالف تھا، وہ مجاہدین کا بھی مخالف تھا، کیونکہ مخالفین کی کامیابی کی صورت میں اسرائیل کا وجود خطرہ میں پڑ سکتا تھا، بشار کو ہٹا کر اخوان کو برسر اقتدار لانا بساط شطرنج پر اسرائیل کے لئے شہ مات کے مرادف تھا، چنانچہ مذاکرات کی میز سے ان چہروں کو ہٹایا گیا جن پر دینی جماعت کا ٹھپہ لگا ہوا ہوا تھا، دینی ذہن کے مجاہدین نے جبہۃ النصرۃ ،جیش الاسلام اور عفلق الشام، احرار الشام وغیرہ کے نام سے اپنی تنظیمیں قائم کرلیں، دینی جماعتوں نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں اور پھر روس اور امریکہ دونوں نے ان کو اپنا نشانہ بنایا، شامی فوج کے نشانہ پر دینی جماعتیں پہلے سے تھیں، یہ وہ جماعتیں تھیں جو شدید مظالم کے خلاف کھڑے ہونے والوں میں صف اول میں تھیں انہوں نے نام نہاد مذاکرات سے خود کو الگ رکھا اور مذاکرات کا منصوبہ بنانے والوں نے بھی ان سے زیادہ دلچسپی نہیں لی، شام کے منظر نامہ میں داعش کا داخل ہونا مزید مصیبتوں کا باعث بنا داعش نے عراق وشام کے کافی بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، امریکہ اور روس دونوں نے مل کر داعش کو شکست دینے کے نام پر شام میں دل کھول کر بمباری کی، جس سے زبردست جانی نقصان ہوا، مصر ہو یا تیونس ہو لیبیا ہو یا شام ہو ہر جگہ انقلابات کی اصل وجہ وہ شدید ظلم ہے جو ان ملکوں میں حاکم اپنے عوام پر کرتے تھے اور کسی کو شکایت کرنے اور احتجاج کرنے کی اجازت نہیں تھی، آزادی تحریر وتقریر دنیا کے تمام ملکوں میں ہر انسان کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے، اس دور کی جمہوریت کے نقطہ نظر سے بھی اور اسلامی شریعت کے اعتبار سے بھی شکایت، احتجاج اور تنقید ہر شہری کا حق ہے، لیکن شام میں اور بہت سے ملکوں میں انسانیت کا نہیں بلکہ جنگل کا قانون رائج ہے وہاں ہر طاقتور حکمران کمزور پر ظلم کرنے کا عادی ہے، وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ ظالم کی ثنا خوانی ہے اور قاتل کی پذیرائی ہے اور انصاف کی رسوائی ہے، وہ ایک تالاب ہے جس میں ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے، یہاں بڑی مچھلی وہ ہے جس کے پاس فوج ہے، پولیس ہے حکومت کی طاقت ہے اور ہر طرح کے ہتھیار ہیں، اسلامی تاریخ میں متعدد اسلامی تحریکیں اسی فوجی اور حکومتی طاقت سے کچل دی گئی ہیں، سانحہ کربلا صرف ایک بار تاریخ میں نہیں پیش آیا ہے بلکہ بار بار پیش آتا رہتا ہے۔اس لئے کہ ان تحریکوں کے ہاتھ میں ہتھیار نہیں ہوتے اور حکومت کی طاقت نہیں ہوتی ہے۔اس لئے ہر دور کا یزید انہیں پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیتا ہے۔

مسلمانوں میں بعض اصحاب فکر ایسے بھی ہیں جن کا کہنا ہے کہ دینی ذہن اور تحریک کے لوگوں کو شام میں اور کئی ملکوں میں شکست کا سامنا ہوا، کیونکہ جب تک طاقت کا توازن نہ ہو اور حکومت سے مقابلہ کی طاقت نہ ہو انقلاب کی کوشش نہیں کرنی چاہئے، حقیقت یہ ہے کہ باغی گروپ شام میں کامیابی کی دہلیز تک پہونچ گیا تھا ۸۰ فی صد ملک پر باغی مجاہدین کا قبضہ تھا، کیا یہ طاقت کافی نہیں تھی کہ حکومت کے ظلم وستم کے خلاف اور بے دینی اور اباحیت کی حکمرانی کے خلاف باشعور عوام کھڑے ہوں، یہ بیرونی طاقتیں تھیں جو حکومت کی کمک پر آگئیں، ایران جسے بشار سے ربط خصوصی تھا میدان میں کود پڑا تاکہ نام نہاد شیعی حکومت کو بچایا جائے، ایرانی ملیشیا حزب اللہ کے سپاہی شام کی شیعی حکومت کو بچانے کے لئے شامی فوج کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے سامنے آگئے، اس پر بھی انقلاب بردوش مجاہدین اور باغیوں کا پلڑا بھاری ہو رہا تھا، اب شامی حکومت نے روس کو دعوت دی کہ وہ آئے اور گرتی ہوئی حکومت کو سنبھالا دے۔روس ایک عالمی طاقت ہے اسے اپنے روایتی حلیف شام کی مدد بھی کرنی تھی اور افغانستان میں مسلمانوں سے شکست کا بدلہ بھی لینا تھا اور ملک شام میں اپنے اقتصادی

مفادات کی حفاظت بھی کرنی تھی ۔داعش کوختم کرنے کے نام پر روس نے شام کی مزاحمتی فوج پرخوب جم کر بمباری کی اور یہ مزاحمتی فوج وہ ہے جو بشار کے خلاف برسر پیکار ہے، روسی طیارے آسمان سے مجاہدین اور مزاحمتی فوج پر جنہیں فری سیرین آرمی بھی کہا جاتا ہے آگ برسانے لگے اور پھر حلب انقلابیوں یا باغیوں یا فری سیرین آرمی کے ہاتھ سے نکل گیا حلب کا سقوط ہوگیا۔شام میں جو جنگ کا منظر نامہ ہے وہ چھوٹے پیمانہ پر عالمی جنگ کا منظر نامہ ہے، یہاں روس بھی بشار کی حمایت میں بمباری کر رہا ہے اور داعش سے کہیں زیادہ مزاحمتی گروپ کو نشانہ بنا رہا ہے اور امریکہ نے داعش کو ختم کرنے کے نام پر اپنی فضائی فوج ملک کی ویرانی میں اضافہ کرنے کے لئے لگا دی ہے، ایران کی بری فوج زمینی لڑائی میں بشار کی فوج کا ساتھ دے رہی ہے اور حزب اللہ کے فوجی بھی شامی فوج کے مددگار ہیں، یہ کہنا غلط ہے کہ شام میں آزادی اور انقلاب کا نعرہ بلند کرنے والوں نے بشار الاسد سے شکست کھائی ہے انہوں نے تو بشار الاسد کو زمین کے بڑے حصہ سے بے دخل کر دیا تھا۔انہوں نے دراصل روس اور امریکا اور ایران اور حزب اللہ کی متحدہ فوج سے شکست کھائی ہے، محدود پیمانہ پر ترکی کی فوجی مداخلت بھی سرحد پر کردوں پر کنٹرول کرنے کے لئے موجود ہے، یہ کرد وہ ہیں جو ترکی میں بھی خلفشار پیدا کرتے ہیں اور امریکہ کی ہمدردیاں کردوں کے ساتھ ہیں، شام کی بہتی گنگا میں یعنی دریائے فرات میں سب ہاتھ دھو رہے ہیں، مرنے والے سب شام کے مسلمان ہیں، شام ایک بہت بڑا مذبح بن گیا ہے جس میں رات دن انسانوں کا یعنی مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔اور دنیا تماشہ بیں بنی ہوئی ہے ۔سقوط شام پر اسلامی عرب دنیا میں مرگ دوام ہے سکوت شام ہے۔

مسلم دنیا کے خلاف عالمی سازش ہے، مغربی ملکوں نے مسلم ملکوں کو اپنا آلہ کار بنایا ہے، خلیجی ملکوں کی مدد سے جمہوری اور دستوری حکومت کا مصر میں پہلے تختہ پلٹا گیا ہے، سعودی عرب کے ذریعہ قطر کا بائیکاٹ مسلمانوں کے درمیان باہمی افتراق پیدا کرنے کی ایک سازش ہے، سعودی عرب نے اسرائیل کے لئے ہندوستان کو فضائی راہ داری بھی دے دی ہے وصال یار میں اور ''من تو شدم تو من شدی'' میں یعنی سعودی عرب اور اسرائیل کی دوستی میں جو کسر باقی ہے وہ بھی جلد پوری ہوجائے گی اور پھر'' معتدل اسلام'' کا نعرہ ، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سعودی عرب مغرب کے جال میں کس قدر پھنس چکا ہے، سعودی عرب ہی میں شاہ فیصل بھی ہوا کرتے تھے جو اخوان المسلمین کے خیر خواہ اور ہمدرد تھے، اب موجودہ سعودی حکمراں اخوان پر دہشت گردی کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں کیونکہ امریکی آقا سعودی عرب سے یہی چاہتے ہیں ، اکتوبر ۱۹۷۳ کی جنگ میں جب اسرائیلی فوج نے امریکی اسلحہ کی مدد سے مصر کو شکست فاش دی تھی تو یہی شاہ فیصل تھے جنہوں نے امریکہ اور اسرائیل کے ہم نوا مغربی ملکوں کو پٹرول کی سپلائی روک دی تھی، جس سے امریکی معیشت غیر معمولی طور پر متاثر ہوئی، پٹرول پمپ پر کئی کیلومیٹر کی لائینیں نظر آنے لگی تھیں، ایک شدید اقتصادی بحران پیدا ہوگیا تھا مغربی طاقتوں نے اسرائیل پر دباو ڈال کر اسرائیلی فوجوں کو واپسی پر مجبور کیا تھا اور اسرائیل کو صحرائے سینا کو خالی کرنا پڑا تھا۔آج وہی سعودی عرب ہے جہاں شاہ فیصل کے جانشین شاہ سلمان اور ان کے ولی عہد محمد بن سلمان اب زلیخائے تہذیب عہد حاضر یعنی امریکہ کے چشم وابرو کے اشارے پر چل رہے ہیں، کتنا فرق ہے شاہ فیصل میں اور محمد بن سلمان میں ۔اس صورت حال کی اس سے بہتر تصویر نہیں ہوسکتی ہے جو ایک فارسی شاعر نے کھینچی ہے۔

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

شاعر کہتا ہے کہ ضعیف پیر کنعاں (یہ استعارہ ہے حضرت یعقوب کا ، یہاں شاہ فیصل کو تصور کیجئے) کی سیاہ بختی اور تیرہ نصیبی دیکھنے کے لائق ہے کہ اس کے نور دیدہ لخت جگر (سعودی ولی عہد) نے زلیخائے تہذیب کی ہوس پوری کر کے اسے روشن چشم اور دلشاد کر دیا۔

اسلام اور مسلمانوں کا درد ترکی کو ضرور ہے لیکن امریکہ نے ترکی میں انقلاب کی سازش کر کے اردگان کو محتاط کر دیا ہے، وہ مجبور ہے کہ روس اور ایران کے ساتھ رشتہ نہ توڑے اور تعلقات قائم رکھے، شام اس کے لئے پل صراط ہے اور اسے سنبھل کر کے چلنا ہے، اس نے اپنی جنگ کردملیشیا تک محدود رکھی ہے، یہی شمالی شام کا وہ علاقہ ہے جہاں امریکہ کردوں کی مدد کرنا چاہتا ہے اور اپنی فوج رکھنا چاہتا ہے، اسرائیل بھی امریکی فوج کی موجودگی ضروری سمجھتا ہے تا کہ ایران اس علاقہ میں اپنے قدم نہ جما سکے حزب اللہ کی مدد نہ کر سکے اور اسرائیل کے لئے خطرہ ثابت نہ ہو سکے، حال میں اسرائیلی جہازوں نے اسی لئے ایران کے بعض فوجی اڈوں پر بم باری بھی کی تھی، ترکی نے بشار کے خلاف کوئی بڑی کاروائی نہیں کی ہے، بشار کے حلیف اور سب سے بڑے مددگار ملک روس کی موجودگی میں یہ ممکن بھی نہیں ہے، لیکن ترکی نے لاکھوں شامی مہاجرین کو پناہ دی ہے، اس کی نیکی اور شرافت اور وسیع القلبی اور دینی حمیت کا یہ سب سے بڑا ثبوت ہے۔

شام میں جنگ بندی پر اتفاق کے باوجود عملی طور پر بموں سے حملے جاری ہیں۔ آزادانہ انتخابات اور عبوری حکومت کے قیام کا وقت کب آئے گا اللہ بہتر جانتا ہے، امریکہ کی فوجی مداخلت بھی روس کی جارحیت کو روک نہیں سکی ہے، دنیا کی دو بڑی طاقتیں شام میں ایک دوسرے کے سامنے ہیں اور دونوں طاقتیں اپنی حمایت یافتہ فوجوں کو اقتدار سپرد کرنا چاہتی ہیں۔

ترکی محتاط ہے اسکی زیادہ پیش قدمی ایران کے لئے دعوت مبارزت بن جائے گی، اس نے عفرین کے علاقہ تک کردوں کی گوشمالی کے لئے خود کو محدود کر رکھا ہے، اس صورت حال میں غوطہ دمشق میں روس اور شامی فوج کی جارحیت کو روکنے والا کوئی نہیں اور جارحیت بھی ایسی شدید کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے، آسمان کا سینہ شق ہو جاتا ہے اور پتھر کا دل بھی پانی ہو جاتا ہے اک آگ کا دریا ہے اور خون کا سمندر ہے اور بے بس انسانوں کی لاشیں ہیں اللھم انی اشکو إليك بثی و حزنی ، بظاہر ابھی افق پر اندھیرا ہے، کہیں دور تک روشنی کی کرن نظر نہیں آتی ہے، سفینہ ساحل نجات تک کب پہونچے گا کسی کو نہیں معلوم، جب ہر ناخدا سے امید کا سر رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تب غیب سے خدا کی کارسازی کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ " فعال لما یرید " ہے، " ولله جنود السموات والارض "، آسمان اور زمین کے تمام لشکر اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ مشیت الہی کے تحت حضرت یوسف کو اندھے کنویں میں ڈال دیا گیا تھا پھر ان کو غلام بنا کر بازار مصر میں فروخت کر دیا گیا تھا اور یہ سلسلہ اسباب اس لئے تھا کہ ایک دن ان کو مصر کا بااختیار فرماں روا بنا دیا جائے۔ یہ بات پہلے کسی کو نہیں معلوم تھی، حضرت یوسف کو بھی نہیں معلوم تھی، شام میں یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور اللہ کو کیا منظور ہے نہیں معلوم۔ انسان بس احکام الہی کی پیروی کا مکلّف ہے۔ جزا اور انعام اللہ ضرور عطا کرتا ہے ظالم کو ظلم کی سزا ضرور ملتی ہے اور وہ کیفر کردار تک پہونچتا ہے اور ہمیں دعا بھی کرنی چاہئے اللھم خذه أخذ عزيز مقتدر ۔ لیکن دعا کب قبول ہوگی یہ سب پردہ تقدیر میں ہے۔ اللہ کے ارادوں کو کوئی نہیں جان سکتا ہے۔

فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ

☆☆☆

پیام سیرت

شہید ماں کا پیغام

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''محمد (ﷺ) کا کلمہ پڑھنا چھوڑ دے ورنہ اس نیزے سے تجھے قتل کردوں گا''

یہ دھمکی تھی ایک جلاّد حاکم کی.....ایک بوڑھی مسکینہ کو۔

قوت و طاقت کے نشہ میں چور ایک ظالم کی.....ایمان و یقین کے نور سے معمور اور لذتِ توحید سے سرشار ایک بے بس ضعیفہ کو۔

میں جب بھی اس بوڑھی کے بارے میں سوچتا ہوں، آنکھیں خون کے آنسو روتی ہیں۔

اسے یاد کر کے دل تڑپ اٹھتا ہے..... روح مضطرب ہو جاتی ہے.....اس لمحہ کا تصور پورے وجود کو تڑپا دیتا ہے۔

وہ بے چاری ضعیفہ تھی..... . . . سچ میں بے چاری تھی وہ..... .بوڑھی تھی ..... . کمزور تھی..... . . . کمر جھک گئی تھی..... کھال میں جھریاں پڑ گئی تھیں.....اس کا شوہر بھی بوڑھا تھا.....ایک جوان بیٹا تھا، مگر وہ بھی بے بس اور لاچار تھا۔

وہ مظلوم تھی ..... مجبور تھی.....اس کا ناتواں جسم ظلم سہنے کی پوزیشن میں بالکل نہ تھا..... مگر.....درندے اس پر ظلم کرتے تھے.....اسے تڑپاتے تھے.....رلاتے تھے.....اپنی قوت اس کے لاغر جسم پر آزماتے تھے.....وہ بے چاری کچھ نہ کر پاتی تھی.....کرتی بھی کیسے.....وہ تھی بھی تو بے بس۔

وہ میری ماں تھی.....سگی تو نہ تھی... مگر سگی سے بھی بڑھ کر تھی.....میں نے اسے دیکھا بھی نہ تھا.....دیکھتا بھی کیسے.....وہ تو مجھ سے بہت پہلے گذر گئی تھی..... مگر مجھے اس سے بہت پیار ہے.....اسے یاد کر کے دل تڑپ اٹھتا ہے۔

اس کی زندگی کا وہ آخری لمحہ..... جب وہ درندہ اسے دھمکی دے رہا تھا.....تاریخ انسانی کی سیاہ ترین لمحہ تھا۔ اس کا تصور آج بھی بدن میں جھرجھری پیدا کر دیتا ہے..... دیدے ناچنے لگتے ہیں.....سر چکرانے لگتا ہے.....آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا ہے.....اور.....ایک لمحہ کے لئے سانس کی رفتار تھم جاتی ہے۔

تصور کے پردہ پر ایک معصوم صورت ابھرتی ہے.....خوبصورت چہرہ جس پر اب جھریاں پڑ گئی ہیں..... بڑی بڑی آنکھیں..... رخساروں پر بہتے آنسو..... چہرے پہ چھلکتا درد..... کمزور و لاغر جسم.....دھوپ میں جلتی ہوئی کھال.....اور معصوم سی صورت۔

اس کی یہ درد بھری تصویر دیکھتا ہوں تو تصور کا پردہ چاک ہو جاتا ہے.....پھر مجھے اپنی حقیقت نظر آتی ہے اور اپنی حقیقت پر رونا آتا ہے۔

رونا اس بات پر زیادہ آتا ہے کہ وہ مجھے سمجھا کر گئی تھی..... .....اچھا برا بتا کر گئی تھی.....اس نے خود تو نہ بتایا تھا.....خود بتاتی بھی کیسے.....میں تو اس کی بات سن بھی نہ سکتا تھا.....میں اس کے پاس تھا ہی کہاں جو سنتا.....اس نے دوسروں سے کہلوایا تھا.....دوسروں کو بتا دیا تھا کہ میرے بیٹے کو اچھا برا بتا دینا..... .....یہ کہنا اور وہ کہنا.....اور انھوں نے مجھے سب کچھ بتا بھی دیا

تھا.....مگر میں بڑا نافرمان نکلا.....اس کی قربانیوں کی لاج نہ رکھ سکا.....جن باتوں سے وہ منع کر کے گئی، انہی میں ملوث ہو گیا.....جن بھلائیوں کا وہ کہہ کر گئی، انہی سے منہ موڑ لیا۔

کبھی اپنی ناہنجاری.....نافرمانی.....احسان ناشناسی ..... اور بدتمیزی کے بارے میں سوچتا ہوں، تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے جی کرتا ہے.....دل چاہتا ہے کہ موت آجائے اور اس احساس بے شرمی سے نجات مل جائے.....بھلا بتائیے آپ اسے کیا کہیں گے کہ جس ماں نے اپنے بیٹے کی خاطر جان دی تھی، وہ بیٹا اسے ہی بھلا دے.....اسی کی نافرمانی کرے.....اسی کا دل دکھائے.....اور جن غلط روشوں سے وہ دور رہنے کو کہہ گئی تھی، انہی کو سینے سے لگائے.....۔

وہ ضعیفی میں بھی چاق و چوبند تھی.....اور میں جوانی میں بھی سست و کاہل.....وہ بیماری میں بھی اپنے رب کی اطاعت شعار تھی اور میں تندرستی میں بھی خطا شعار.....وہ کبھی حرام کے قریب نہ پھٹکی اور میری صبح و شام ہی غلط کاموں میں بسر ہوتی ہے۔

''محمد کا کلمہ پڑھنا چھوڑ دے، ورنہ اس نیزے سے تیری جان لے لوں گا''

رہ رہ کے مجھے اس ظالم کے یہ دھمکی آمیز الفاظ آتے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ وہ لاغر و ناتواں ضعیفہ جرأت و جلال کا پہاڑ ثابت ہوتی ہے.....اس کی قوت برداشت دیکھ کر پہاڑ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔

''تو جو چاہے کر لے.....مگر..... میں محمد کا نام چبانا نہیں چھوڑ سکتی''۔

اور پھر.....وہ ہوتا ہے.....جس کے ذکر کی سکت مجھ میں نہیں۔

وہ اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے.....ظالم اسے شہید کر دیتا ہے.....دنیا کا سب سے بڑا ظالم.....تاریخ انسان کا سب سے مکار انسان..... .....امت محمدیہ کا فرعون۔

سوچتا ہوں کہ اس نے اپنی جان کیوں دی تھی.....اسی لیے تو کہ اس کے بیٹے تک حق بات پہنچ جائے.....اس کا بیٹا جہنم کی آگ سے بچ جائے... مگر یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ بیٹا خود ہی آگ میں کودنے کو بے تاب ہے۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ میری یہ ماں کون تھی..... وہ صرف میری ہی نہیں، آپ کی بھی ماں تھی.....وہ مکہ میں رہتی تھی.....آج سے چودہ سو برس پہلے کی بات ہے..... وہ مسلمان تھی.....محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ ایمان لے آئی تھی.....اور یہی اس کے مشق ستم بننے کا سبب تھا.....مکہ والوں کو اس کا ایمان قبول نہ تھا.....مگر وہ بھی پھرنے والی نہ تھی.....اس جیسی جرأت منداور بہادر بوڑھی شاید ہی کوئی گذری ہو۔

وہ تو چلی گئی مگر مجھے پیغام عمل دے گئی... اسے دیکھتا ہوں، اور خود کو دیکھتا ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں... مگر پھر سوچتا ہوں کہ ابھی وقت ہے سدھرنے کا اور اپنی ماں کو منانے کا.....وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے.....تم ہی بتاؤ نہ، اسے کیسے مناؤں. کیسے اسے راضی کروں.....ویسے وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے.....اس کی باہیں میرے لیے آج بھی کھلی ہیں.....اس کی ممتا آج بھی میرے لیے تڑپ رہی ہے.....اب دیکھیے مجھے کب توفیق ہوتی ہے اسے منانے کی۔

اگر آپ کی اس سے خواب یا بیداری یا کسی بھی حالت میں ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا..... وہ اب اس دنیا میں تو نہیں ہے.....مگر میرے دل میں ہر وقت ہے.....آپ سوچتے ہوں گے کہ ہم اسے پہچانیں گے کیسے... .. تو میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں.....اس کا نام سمیہ ہے.....سمیہ.....میری ماں.....اللہ اس سے راضی ہو.....آپ میرا اسلام پہنچائیں گے نا؟؟؟

☆☆☆

❑ خاص تحریر

ایک بلبل ہے کہ ہے محو ترنم اب تک

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

نوٹ: ''صاحب مضمون نے یہ مضمون بھٹکل میں گزشتہ ماہ فروری میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی جامع الکمالات شخصیت پر منعقد ہونے والے سیمینار میں پڑھا تھا، افادۂ عام کی غرض سے انھوں نے ندائے اعتدال کو ارسال کیا جواب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے''۔

اسلامی تاریخ میں علماء کی کمی نہیں رہی بیسویں صدی میں بھی آسمان کے روشن ستاروں کی طرح علماء بے شمار ہوئے اور ان سے یہ زمیں روکش کہکشاں بن گئی، کوئی عالم دین روحانیت اور ربانیت میں آفتاب و ماہتاب تھا، کوئی عالم دین تفسیری خدمات میں یا حدیث کی خدمات میں بلند مقام کا حامل تھا، کسی نے فقہ کے میدان میں بیش بہا خدمات انجام دی تھی کسی نے تنہا سیرت نبوی کے موضوع پر انسائکلو پیڈیا مرتب کر ڈالی تھی، کسی نے اسلامی تاریخ مرتب کرنے کا عظیم کارنامہ انجام دیا تھا، کسی نے اسلامی علوم کی کوئی شاخ اپنے لئے منتخب کی اور اسے شاداب اور بہار آشنا کیا، کسی نے جدید علم کلام کو اپنا موضوع بنایا اور اسلام پر اعتراضات کے مدلل اور تشفی بخش جواب دئے اور مغرب کے سحر سامری کو توڑ ڈالا ایسے علماء بھی پیدا ہوئے جنہوں نے غیر ملکی اقتدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں جان و مال کی قربانیاں دیں، ایسے علماء بھی سامنے آئے جنہوں نے اپنے اپنے ملکوں میں اسلام کے نظام حیات کو برسر عمل لانے کی کوشش کی یہ تمام علماء قابل قدر اور لائق فخر ہیں اور امت اسلام کو ان سب کا شکر گذار ہونا چاہئے۔

مولانا علی میاں کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے علماء کی گوناگوں خصوصیات کو اپنے اندر جمع کرلیا تھا، ان کی شخصیت عطر مجموعہ کی مانند تھی، قرآن کا مطالعہ ان کا خصوصی میدان تھا، ان کی شخصیت قرآن کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی اور سیرت نبوی کی خوشبو میں بسی ہوئی تھی، وہ مفکر بھی تھے، مؤرخ بھی تھے، ادیب بھی تھے، اور عربی اور اردو کے بلند پایہ مصنف اور نثر نگار بھی تھے، مذہبی قائد بھی تھے، تصوف اور روحانیت میں بڑے مقام کے حامل تھے، اور اسی کے ساتھ ان کا بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ عالم اسلام کے محتسب اور نگراں بھی تھے، اقبال کی طرح ان کا بھی نظریہ تھا'' ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب کائنات'' مولانا عربوں کا احتساب کرتے تھے آج ہمارے علماء عربوں کے زر وسیم سے اکتساب کرتے ہیں، مولانا کے یہاں درباروں سے دوری تھی، آج علماء کے یہاں درباروں میں نیازمندی اور حضوری ہے، مسلم ملکوں میں کوئی کام خلاف اسلام ہوتا، کوئی غلط گمراہ کن نظریہ پھیلایا جاتا، مولانا کی غیرت وحمیت اسے برداشت نہیں کرتی مولانا اس موضوع پر لکھتے اور تقریریں کرتے، مولانا کی عربی زبان عام حالات میں گوہر بار ہوتی تھی، لیکن جہاں دین کو کوئی

نقصان پہونچتا ہو، چاہے وہ عرب ملک ہی میں کیوں نہ ہو، تو پھر ان کا قلم شرربار اور تیغ جوہر دار بن جاتا تھا، ترکی کے کمال اتاترک کا ذکر آئے یا مصر کے جمال عبدالناصر کا تذکرہ ہو مولانا کے قلم کو آتش بار دیکھا گیا، ان دونوں نے عالم اسلام کو جو نقصان پہونچایا ہے مولانا اس سے شدید نالاں تھے، مولانا اس وقت اگر بقید حیات ہوتے ان کی غیرت کی زبان اور حمیت کے قلم کی تنقید کے تیروں کا رخ عبدالفتاح سیسی کی طرف ضرور ہوتا، جس نے جمال عبدالناصر کے ظلم کی یاد تازہ کردی بلکہ اسے بھی پیچھے چھوڑ دیا، مولانا کے غیض وغضب کا نشانہ وہ عقال پوش اور عبابدوش اور بادہ نوش اور ایمان فروش اور محروم عقل وہوش عرب حکمراں بھی ہوتے جو عبدالفتاح سیسی کے خاص مددگار تھے، ان کی شرربار تحریر وتقریر کا نشانہ وہ خلیجی ملک بھی ہوتے جہاں علانیہ دین داری اور اسلام پسندی کو جرم اور دہشت گردی قرار دیا جارہا ہے، جو لوگ حالات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ عرب دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے وہ مذہبی ذہن رکھنے والوں کے لئے آشوب قیامت سے کم نہیں، حرمین کی سرزمین میں تین سو سینما گھر کھولے جارہے ہیں، مغربی ثقافت کو درآمد کرنے کا انتظام ہو رہا ہے اور اس کا لنام معتدل اسلام رکھا گیا ہے، بعض عرب ملکوں میں اخبارات کی رپورٹ کے مطابق حفظ قرآن اور مسجدوں میں دینی بات کرنا بھی جرم ہوگیا ہے اور اس کی سزا ۵۱ ہزار درہم مقرر ہے (روزنامہ انقلاب ۱۷ نومبر ۲۰۱۷) ہر جگہ دینی قیادت کو سخت سزا اور عقوبتوں کا سامنا ہے، یہ عصر حاضر کا سانحہ کربلا ہے، آج بھی اہل دین کے لئے وہی آبلہ پائی ہے، وہی دشت نوردی ہے، وہی صحراء ہے اور آج بھی وہی کوئے نفاق موجود ہے جس کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اوپر قصر سلطانی کا گنبد ہے، لیکن ہمارے علماء دین کے لب اظہار پر تالے اور زبان قلم پر چھالے پڑے ہوئے ہیں، یہ تنقید کسی خاص شخصیت پر نہیں ہے بلکہ ان تمام چھوٹی اور بڑی دینی قیادتوں پر ہے جو برصغیر میں سرگرم عمل رہتی ہے اور اتنی خطرناک باتوں کا نوٹس نہیں لیتی ہیں اور جسے "لسانا وشفتین" کی نعمت ملی تھی لیکن اس نے ان سے کام نہیں لیا۔

علماء اور اچھے خاصے دیندار لوگوں کا کہنا ہے کہ دینی اداروں کا بڑا نقصان ہوجائے گا اگر ان اداروں کے ذمہ دار عرب حکمرانوں کی ان غلطیوں پر نکتہ چین ہوں گے، ہم یہاں کشکول گدائی رکھنے والے علماء کو اور دینی اداروں کے ذمہ داروں کو مولانا علی میاں کا ایک قول یاد دلانا چاہیں گے، مولانا نے ایک موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اللہ تعالی اس دن سے پہلے ہمیں دنیا سے اٹھا لے جس دن ہم ان خلیجی بادشاہوں اور حکمرانوں کو اپنا رزاق سمجھنے لگیں گے"۔ اب مولانا کی غیرت اور حمیت کا کوئی ہندوستان میں وارث نہیں رہ گیا ہے اور نہ کوئی ان کے استغناء اور توکل کا نمونہ پیش کرنے والا ہے، اور نہ کوئی عرب دنیا میں پیدا ہونے والے "الفتنۃ الکبری" پر نکیر کرنے والا باقی رہا ہے البتہ اسی خاندان کا ایک فرد ہے، جس نے حق گوئی کو اپنا شعار بنا رکھا ہے، ایک ٹوٹی ہوئی مینا ہے جو ساقی کو رو رہی ہے ایک بلبل ہے جو خزاں کے منظر پر نوحہ کناں ہے ؎

ایک بلبل ہے کہ محو ترنم اب تک
اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

مولانا علی میاں کی شخصیت ہمہ جہت اور ہمہ پہلو تھی، وہ ہشت پہل ہیرے کے مانند تھے، مولانا نے مصلحین امت اور صوفیاء کرام کا تذکرہ لکھا ہے، اس اعتبار سے وہ مؤرخ تھے، وہ مدارس میں اصلاح نصاب اور مسلم ملکوں میں اصلاح فکر وذہن کے بڑے وکیل اور ترجمان تھے، اس اعتبار سے وہ مفکر اسلام تھے اسی کے ساتھ وہ ایک صوفی باصفا اور شیخ طریقت بھی تھے اور روحانیت

میں ان کا پایہ بہت بلند تھا، اس کی گواہی اہل صدق وصفا نے دی ہے، ان سب کے ساتھ وہ احیائے اسلام کے بہت بڑے داعی تھے، ایسی جامعیت کی شخصیت مشکل سے پیدا ہوتی ہے، لیکن مولانا کی شخصیت کی امتیازی صفت ان کی غیرت وحمیت ہے، مولانا کا عرب وعجم میں احترام تو بہت کیا گیا لیکن اس کے باوجود علماء نے اور دینی مدارس کے ذمہ داروں نے اور دینی جماعتوں کے رہنماؤں نے ان کو اپنا رول موڈل نہیں بنایا، بڑے بڑے علماء ان کے دست گرفتہ ہوئے، اہل سلوک نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی، لیکن مولانا کے افکار وخیالات کو انہوں نے جذب نہیں کیا، انہیں مولانا کے ذریعہ مقامات سلوک طے کرنے کی فکر لاحق رہی لیکن ملت اسلامیہ کیلئے مولانا کی بصیرت مندی اور دردمندی اور فکر کی ارجمندی اور مزاج کی غیرت مندی اور جرأت مندی کی انہوں نے بالکل اقتداء نہیں کی، علماء مولانا کا احترام بہت کرتے تھے لیکن اصلاح نصاب اور اصلاح ذہن وفکر سے متعلق ان کے خیالات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، مولانا کی آواز صدا بصحراء رہی، ایک دور افتادہ صدا جسے گوش حق نیوش بڑے پیمانہ پر نصیب نہ ہوسکا، نہ دینی جماعتوں کے بارے میں مولانا کی اعتدال پسندی قابل تقلید ٹھہری، وہی عصبیت اور مسلکی شدت مولانا کے بعد بھی باقی رہی۔

مولانا کے کمال پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہئے کہ مولانا اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایک زاہد مرتاض اور ایک عابد شب زندہ دار شخص تھے یا یہ کہ وہ ایک ادیب اور مصنف تھے، ان دونوں مزاج کا تقاضہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے خلوت کدہ سے باہر نہ آئے ، لیکن ملک کے حالات کا تقاضہ تھا کہ برادران وطن کو خطاب کیا جائے چنانچہ مولانا نے پورے ملک میں پیام انسانیت کی تحریک شروع کردی یہ بھی مولانا کے لئے گویا اپنے مشغلہ کے تقاضے اور مزاج وطبیعت کے خلاف ایک جہاد تھا اور پھر یہ بھی جہاد تھا کہ مسلمانوں میں ایمان کی حرارت پیدا کرنے کے لئے مولانا نے آسمان وزمین کے قلابے ملا دیے، دشت ودریا سب عبور کر ڈالے اور ملکوں ملکوں کا سفر کیا اور وہ بھی صحت کی خرابی اور علالت کے ساتھ، اپنی تمام معذوریوں کے باوجود مولانا بہت فعال اور متحرک شخصیت کے مالک تھے اور روح جہاد ان کے اندر حلول کر گئی تھی، پیام انسانیت کی تحریک کو ہندی میڈیم میں سارے ملک میں پھیلانے کی ضرورت ہے، مولانا علی میاں اپنی تمام علمی اور دینی مصروفیات اور عالم اسلام سے گہرے تعلقات کے باوجود سب سے ملتے تھے، ہر ایک کی مدد کے لئے تیار رہتے تھے، اخلاق نبوی سے متصف تھے، پورے عالم اسلام کی نگرانی اور نگہبانی کا فریضہ انجام دیتے تھے اور وہاں اہل دین کے ہاتھ میں سیاست کی زمام دیکھنے کی خواہش نے مولانا سے عربی میں کتابیں لکھوائیں، سیاسی لیڈروں سے ملاقاتیں کروائیں مولانا کی سوز وگداز سے لبریز عربی اور اردو میں تحریریں ہیں، جس میں مولانا نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے، اس سمینار کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ علماء اور قائدین مہر سکوت توڑیں اور حق گوئی کا فریضہ ادا کریں اور احیائے اسلام کو اپنا نصب العین بنائیں، برصغیر کے وہ علماء جو عرب ملکوں کے اداروں کے ممبر ہیں انہیں چاہئے کہ اداروں کی رکنیت سے استعفا دیں، ان اداروں کی رکنیت اب ملت کے لیے مفید نہیں رہی، بلکہ اب تو یہ ادارے ملت کی شبیہ اور اس کی دینی شناخت کو ختم کرنے کے کام پر لگا دیے گئے ہیں۔

☆☆☆

❑ تعزیت

ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمیؒ - حیات اور کارنامے

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمیؒ کے انتقال کے تیسرے دن ۲۲/دسمبر ۲۰۱۷ء کو ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی تھی، اس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر اشتیاق احمد ظلی نے فی البدیہ صدارتی تقریر فرمائی تھی، جسے اس وقت ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ افسوس کہ ڈاکٹر اعظمی جیسے عظیم محدث و محقق کے گزر جانے پر ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں ہنوز کوئی وفیاتی مضمون یا تعزیتی نوٹ شائع نہیں ہوسکا ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر پروفیسر ظلی صاحب کی گراں قدر صدارتی تقریر تحریری صورت میں پیش ہے۔ جس میں ڈاکٹر اعظمیؒ کی حیات اور کارناموں کے تعلق سے اہم معلومات موجود ہیں۔ واضح رہے کہ اس نشست میں سابق ڈین فیکلٹی دینیات مسلم یونی ورسٹی پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی اور اکیڈمک اسٹاف کالج مسلم یونی ورسٹی کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے بھی خطاب فرمایا تھا جس کا حوالہ پیش نظر تقریر میں مختلف مقامات پر موجود ہے۔ (مرتب: محمد اسماعیل اصلاحی)

محترم حاضرین کرام!

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی صاحب کے سلسلے میں دو اہم تقریریں آپ سن چکے ہیں۔ ان کی زندگی کے بعض اہم گوشے آپ کے سامنے آچکے ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ کچھ ایسی باتیں آپ کے سامنے عرض کروں جو آپ کے سامنے نہیں آسکی ہیں۔

حضرات!

ہندوستان کی ایک بڑی خوش نصیبی یہ رہی ہے کہ عہد وسطیٰ ہی سے حدیث کی خدمت کے سلسلے میں اس ملک کو بڑا امتیاز حاصل رہا ہے۔ خود عرب علماء نے تسلیم کیا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اگر ہندوستانی علماء نے حدیث کی طرف توجہ نہ کی ہوتی تو جو صورت حال عام طور پر عالم اسلام میں تھی اس کے پیش نظر اس علم کی شاید وہ صورت ہیئت نہ ہوتی جو اب ہے۔ اسی نہایت روشن روایت کا ایک حصہ اعظم گڑھ منتقل ہوا۔ اللہ کا کرم کچھ ایسا ہوا کہ وہاں کئی بہت عظیم الشان محدثین پیدا ہوئے۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری، مولانا عبیداللہ رحمانی اور ابھی کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا جب مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا انتقال ہوا، عالم اسلام کا بے بدل محدث، اسی خطۂ اعظم گڑھ اور اسی مئو سے تھا۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی صاحب ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے، ان کے جو کارنامے ہیں ان کی جو خدمات ہیں اور انھوں نے نہ صرف حدیث شریف بلکہ قرآن مجید کے سلسلے میں جو علمی کاوشیں کیں، اور جو نہایت اعلیٰ درجے کا لٹریچر چھوڑا اس کی مثال اس زمانے میں کوئی اور نہیں۔ ایک تنہا شخص نے اپنی زندگی میں جو کام کر ڈالا اس کے لیے انجمنوں کی ضرورت ہوتی ہے، اکیڈمیز کی ضرورت ہوتی ہے۔

مجھے جب ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی اطلاع ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی نے ریاض سے پرسوں صبح صبح دی تو ایک افسوس جو

مجھے مستقل تھا وہ اور گہرا ہو گیا کہ ان کی ایک خواہش تھی جس کو میں پورا نہیں کر سکا۔ وہ اپنی مشہور کتاب History of the Quranic Text-From revelation to compilation کا ترجمہ دارالمصنفین سے چھپوانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے مجھے فون کیا اور اس تعلق سے ایک لمبی گفتگو ان سے ہوئی۔ اس بڑھاپے میں ان کی خواہش تھی کہ وہ کتاب چھپ جائے اور دارالمصنفین سے چھپ جائے۔ میری بھی بڑی شدید آرزو تھی کہ یہ کتاب دارالمصنفین سے چھپے۔ لیکن اس صورت میں اس کا وہاں سے چھپنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اب یہ کتاب پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کے پاس ہے، اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اب وہ چھپے گا، اور ہم سب کو استفادے کے لیے دستیاب ہوگا۔ لیکن ان کی وہ خواہش کہ دارالمصنفین سے چھپے، اس کو میں پورا نہ کر سکا۔ اس کا مجھے مستقل افسوس رہے گا۔

میرے عزیز دوست پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی نے کہا کہ یہاں (علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں) شاید ان کا داخلہ نہیں ہوا تھا۔ اس مختصر وقت میں ان کے تعلق سے جو معلومات میں ان کے تعلق سے جمع کر سکا ہوں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا داخلہ یہاں ہو گیا تھا۔ وہ ایک سال یہاں رہے اور داخلہ پی ایچ۔ڈی میں ہوا تھا۔ ان کے مقالہ کا عنوان ''شیخ محمد بن عبدالوہاب'' تھا۔ ایک سال بعد وہ چلے گئے۔ جب انھوں نے کیمبرج میں داخلہ لیا تو وہاں ریسرچ کا کام کم از کم تین سال میں کرنا تھا، اس کو انھوں نے دو سال میں پورا کر لیا۔ اور دو سال بعد جب اس کو جمع کرنا چاہا تو غالباً ضابطہ کا حوالہ دیا گیا کہ تین سال سے کم وقت میں تھیسس جمع نہیں ہو سکتی، اس پر انھوں نے کہا کہ میں ایک سال علی گڑھ میں پہلے ہی ریسرچ کر چکا ہوں۔ اس کا کوئی حوالہ میرے پاس نہیں ہے، لیکن ان کے خاندانی حلقوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ جب انھوں نے کہا کہ میں ایک سال کام کر چکا ہوں تو کیمبرج یونی ورسٹی نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے دریافت کیا اور یہاں کے جواب پر ان کو مقالہ جمع کرنے کی اجازت مل گئی۔ بہرحال وہ علی گڑھ آئے تھے، یہ بات طے ہے۔ اس لیے کہ یوٹیوب پر ایک انٹرویو میں انھوں نے یہ بات کہی ہے کہ انھوں نے علی گڑھ میں داخلہ لیا تھا۔

اعظم گڑھ میں دارالعلوم مئو میں انھوں نے پڑھا اور اس کے بعد دارالعلوم دیوبند۔ جب ان کو فیصل ایوارڈ ملا تو انھوں نے اپنی تقریر میں ان دونوں اداروں کا خاص طور پر اپنی شخصیت کی تعمیر و ترقی میں حوالہ دیا تھا، دارالعلوم مئو اور دارالعلوم دیوبند۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کو مستشرقین سے کب اور کن حالات میں دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ اس سلسلہ میں اتنے حساس کیوں ہو گئے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی۔

علی گڑھ کے بعد جب وہ قطر گئے تو وہاں انھوں نے جو کتابیں پڑھیں ان میں سے ایک کتاب ایک مستشرق کی تھی The Origins of Mohammadan Jurisprudence اس کتاب کے مطالب یہ ہیں کہ قرآن کوئی الہامی کتاب نہیں ہے اور حضور ﷺ کے نام کی کوئی شخصیت نہیں تھی، یہ تو سب بعد میں مسلمانوں نے گھڑ لیا

ہے۔ یہ افسانہ ہے، طبع زاد ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ 'جوزف شاخت' کا کہنا یہ ہے کہ جتنی بھی احادیث فقہی احکام کے سلسلے میں نقل کی جاتی ہیں ان میں سے کسی کا کوئی وجود نہیں ہے، سب بے اصل ہیں جو بعد میں دوسری تیسری صدی ہجری میں مسلمانوں نے گھڑ کر لکھی ہیں۔ اس کے بعد ان کو حدیث کا نام دے دیا ہے۔ جو نکتے اس نے اٹھائے ہیں اس میں سے ایک نکتہ آپ بھی سن لیجیے۔ امام مالک کی پیدائش کے سلسلے میں جو تاریخیں ہیں وہ بالکل معلوم ہیں۔ ان کا ایک بہت مشہور سلسلہ ہے مالک عن نافع عن عبداللہ ابن عمر عن رسول اللہ ﷺ، جس کو سلسلۃ الذہب کہتے ہیں، اس نے پورا زور لگا دیا یہ ثابت کرنے پر کہ مالک کی ملاقات نافع سے ہوئی ہی نہیں، لھٰذا اس سلسلے کی جتنی بھی احادیث ہیں سب غلط ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد، گرچہ تفصیل کہیں ملتی نہیں لیکن آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ان کے ذہن میں ایک انقلاب آیا، اور انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ یہ ایک بڑا فتنہ ہے اس کا سد باب ہونا چاہیے۔ اسکے بعد انھوں نے کیمبرج میں داخلہ لیا۔ اور وہاں انھوں نے جو کتاب لکھی Studies in Early Hadith letrature اس کا ترجمہ 'دراسات فی الحدیث النبوی وتاریخ تدوینہ' کچھ اضافے کے ساتھ شائع ہوا۔ یہاں سے یہ داستان شروع ہوتی ہے اور پھر یہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ وہ ایک کتاب لکھ کر کے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ گئے بلکہ پھر ایک سلسلہ شروع ہوا۔ لوٹ کر قطر آئے، قطر کے بعد سعودیہ آئے، سعودیہ میں آکر انھوں نے گویا لنگر ڈال دیا۔ جامعۃ الملک سعود نے ان کو وہ سہولتیں فراہم کیں، ان کو وہ ماحول فراہم کیا جہاں وہ اپنی مرضی کے مطابق کام کر سکیں۔ اس میں یقینی طور پر جامعۃ الملک ابن سعود کا بھی ایک بڑا کردار ہے۔ اگر ان کو وہ وسائل فراہم نہ ہوتے، اگر ان کو ماحول میسر نہ آتا، تو شاید اتنا کام نہ کر پاتے، کام تو کرتے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر اتنی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں لیکن شاید اتنا کام نہ ہوتا۔

کیمبرج میں جو کام انھوں نے کیا تھا اس میں ابتدائی طور پر ان کے سپر وائزر پروفیسر 'آربری' تھے، بعد میں کسی وجہ سے 'پروفیسر سارجنٹ' کی نگرانی میں انھوں نے کام مکمل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے ''کتّاب النبی'' پر کتاب تیار کی۔ ''کتّاب النبی'' پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس فہرست میں بعض ایسے ناموں کا اضافہ کیا تھا، جو اس سے پہلے کسی محقق نے نہیں کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے منہج النقد عند المحدثین نشاته و تاریخه، محدثین کے نقد کا جو طریقہ ہے اس کے بارے میں آپ سب واقف ہیں کہ محدثین کے نقد ونظر کا پیمانہ کیا تھا، اس کے اصول کیا تھے، ان کا معیار کیا تھا، اس پر انھوں نے مستقل ایک کتاب لکھی۔ اس کے بعد 'دراسات منهجية فی علم الحديث' کتاب لکھی، اس کے بعد Studies in Hadith Methodlogey and letrature پھر انھوں نے جوزف شاخت کی کتاب، جہاں سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا اسکو اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور اس پر ایک پوری کتاب لکھی'' اصول الفقہ المحمدی للمستشرق

شاخت: دراسۃ نقدیۃ''مستشرق شاخت کے ایک ایک نکتے کو، ایک ایک بات کو، ایک ایک حوالے کی انھوں نے تنقید کی اور اس کو ثابت کیا کہ سب جھوٹ کا پلندہ ہے، اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے، یہ ان کی ایک غیر معمولی کتاب ہے۔

اپنی عمر کے آخری مرحلہ میں وہ کئی اہم کام کررہے تھے، معلوم نہیں کہ وہ کس پوزیشن ہیں۔لیکن ایک کتاب ابھی انتقال سے کچھ ہی دن پہلے آئی تھی، ابھی شاید بازار میں نہیں پہنچی ہے۔اس کا نام ہے' النص القرآنی الخالد عبر العصور' اس میں سورہ بنی اسرائیل کا خاص طور پر مطالعہ کیا گیا ہے۔ چودہ سو سال میں قرآن مجید کے جو مخطوطات دستیاب ہیں ہزاروں کی تعداد میں۔ آپ جانتے ہوں گے کی جرمنی میں ان کا ایک مطالعہ ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ایک محقق اگر کسی کتاب کے دو نسخوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس میں بے شمار اختلافات ملتے ہیں۔اسی لیے جب محقق کسی کتاب کے دو نسخوں کا مطالعہ کرتا ہے تو نسخوں کے اختلافات کا ذکر کافی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے کہ یورپین محققین جانتے ہیں اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ قرآن مجید کے چودہ سو سال میں جو نسخے پائے جاتے ہیں ان میں اتنے اختلافات ہوں گے کہ ساری عمارت اس کی صحت کی خود بخود ڈھہ جائے گی، چنانچہ ایک پروگرام بنا اور قرآن مجید کے ہزاروں نسخوں کو جمع کیا گیا کہ ان نسخوں کی روشنی میں قرآن مجید کا مطالعہ کیا جائے اور اس بنیاد پر قرآن مجید کے نسخوں میں تضادات کو تلاش کیا جائے۔ جنگ عظیم دوم سے پہلے اس کی عارضی رپورٹ آ گئی تھی جس میں بے حد مایوسی کے ساتھ اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ کہیں کوئی چیز ایسی نہیں ملی الا آں کہ چھوٹی موٹی جو انسانی غلطیاں ہوتی ہیں، یہ صرف قرآن مجید کا اعجاز ہے۔آپ دنیا میں کسی بھی کتاب کو لے لیجیے، بغیر کسی استثناء کے، کوئی بھی کتاب الماری سے اٹھا لیجیے جس کے دو نسخے ہوں آپ کو اس میں ہزاروں اختلافات مل جائیں گے۔ یہ صرف قرآن کا اعجاز ہے، کتاب الٰہی کا اعجاز ہے کہ اس کے ہزاروں لاکھوں نسخوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ سارا قصہ برلن کی بمباری میں ختم ہو گیا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے جو کام کیا ہے، ظاہر ہے وہ نص قرآنی کا مطالعہ ہے۔اس کا عربی اور انگریزی دونوں میں انھوں نے مقدمہ لکھا ہے۔انگریزی میں ان کے مقدمے کا عنوان ہے Ageless Quran Timeless text

یہ تو ان کی تحقیقات ہیں اس کے علاوہ انھوں تدوین کا کام بھی کیا ہے اور بڑے پیمانے پر کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے موطا امام مالک پر کام کیا۔ میرے خیال سے شاخت نے موطا امام مالک کو بے یقین بنانے کے لیے، اس کے اعتبار کو ختم کرنے کے لیے جو کام کیا تھا اس سے متاثر ہو کر انھوں نے موطا پر کام کیا۔ظاہر ہے موطا بالکل ابتدائی کتاب ہے بعض حضرات کا خیال ہے کہ اصح الکتب بعد کتاب اللہ موطا ہے۔اس لیے کہ وہ سند جس کا ابھی ذکر کیا، ایسی سند تو کسی کتاب میں مل نہیں سکتی کہ حضور ﷺ اور ان کے بیچ صرف تین واسطے ہوں اور مزید یہ کہ جب وہ درس کے لیے بیٹھتے ہوں تو اس طرح کہتے ہوں کہ عن مالک عن نافع عن عبداللہ بن عمر عن صاحب ھذا القبر، وہ امام اہل

مدینہ تھے۔تو سب سے پہلے انھوں نے موطا امام مالک کا تحقیقی ایڈیشن شائع کیا۔اس کے بعد صحیح ابن خزیمہ جو امام محمد ابن اسحاق الخزیمہ السلمی النیشا پوری ہیں ان کی صحیح کو مرتب کیا جو چھپی نہیں تھی اور جس کے تین حصے ضائع ہو گئے تھے۔ایک حصہ ان کو ملا اس کو انھوں نے مرتب کیا۔اس میں وہ حدیثیں بھی ہیں جو صحیحین میں نہیں ہیں۔انھوں نے سنن ابن ماجہ کو پھر سے ایڈٹ کیا، العلل یعنی حدیث میں علل کا جو موضوع ہے اس پر علی ابن مدینی کی کتاب تھی اس کو انھوں نے مرتب کیا، امام مسلم کی کتاب التمییز کو انھوں نے مرتب کیا اور مغازی رسول ﷺ لعروہ ابن زبیرؓ کو بھی انھوں نے مرتب کیا۔اس طرح دس کتابیں ادھر اور چھ کتابیں یہ، جو انھوں نے مرتب کیں، یہ غیر معمولی کام ہے۔

ان غیر معمولی خدمات کے علاوہ عالم اسلام کے وہ پہلے شخص ہیں جس نے کمپیوٹر کو حدیث کی خدمت کے لیے استعمال کرنے کی طرح ڈالی اور اس کو استعمال کیا۔ظاہر ہے کہ بہت پہلے جب وہ کیمبرج میں پی ایچ۔ڈی کا کام کر رہے تھے تو ان چیزوں سے ان کا واسطہ پڑا۔کرسچین اور جیوش ٹکسٹ کو جس طرح کمپیوٹر پر محفوظ کیا جا رہا تھا اور جس طرح اس کی اسٹڈی کی جا رہی تھی وہ ابتدائی زمانہ کمپیوٹر کا تھا، پھر شکاگو کی ایک کانفرنس میں ایک مستشرق نے کمپیوٹر کو حدیث کی اسٹڈی کے سلسلے میں استعمال کرنے کی طرف اشارہ کیا، تب ان کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہوگئی کہ کمپیوٹر کی شعبدہ بازی سے نہ جانے کیا کیا تماشے بنائے جائیں گے اور کیا کیا گل کھلائے جائیں گے، انھوں پہلی فرصت میں کمپیوٹر کو حدیث کے لیے استعمال کرنے کی طرح ڈالی۔یہ بات ہے سن ۱۹۷۰ء کی جس کو تقریباً پچاس سال ہونے کو ہیں۔اس کی تفصیلات کوئی کمپیوٹر کا ماہر ہی بیان کرے تو صحیح بیان کریگا۔لیکن حقیقت ہے کہ کمپیوٹر کو حدیث کی خدمت کے لیے انھوں نے جس طرح استعمال کرنے کی طرح ڈالی اور جس طرح سے استعمال کیا کہ کمپیوٹر پر بڑے پیمانے پر وسیع لٹریچر حدیث کا آچکا ہے، اس میں ڈاکٹر اعظمی کی خدمات بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔سب سے پہلے انھوں نے ابن ماجہ کے ٹکس کو کمپیوٹر کی مدد سے تیار کیا اور پھر ایک سلسلہ ہوگیا کہ احادیث کا مطالعہ کمپیوٹر کی مدد سے کس کس طرح کیا جائے۔شیوخ کے لحاظ سے اس کو کس طرح مرتب کیا جائے، عناوین اور موضوعات کے لحاظ سے اس کو کس طرح مرتب کیا جائے۔نوجوان اسکالرس جو یہاں بیٹھے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کمپیوٹر کو کس کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ان سب طریقوں سے انھوں نے استعمال کیا اور اسطرح ایک بڑا کینوس تیار کیا کمپیوٹر کے لیے جس کو حدیث کے لٹریچر کے لیے ہم سب استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد مصطفیٰ الاعظمی اس شخصیت کا نام تھا، جنھوں نے حدیث اور قرآن مجید کی وہ خدمت کی، ان جہتوں سے خدمت کی جن کی طرف دوسرے لوگوں کا دھیان بھی نہیں جاتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے پیچھے ایسا لٹریچر چھوڑ گئے کہ جب بھی یہ موضوع زیر بحث آئے گا، جب بھی مستشرقین کی دسیسہ کاریوں کی بات ہوگی، جب بھی ان کے فریب اور دجل کی بات ہوگی، جب ان کی تاریخ کو مسخ کرنے کی بات آئے گی تو

ڈاکٹر مصطفیٰ الاعظمی کا نام آئے گا، ان کی کتابوں کا حوالہ آئے گا۔اس طرح ان کا یہ علمی مشن ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ صدقۂ جاریہ بھی رہے گا اور دنیا ان کی کتابوں سے مستفید ہوتی رہے گی۔

ہماری بدنصیبی یہ ہے کہ ہندوستان کا ایک فرزند جس نے اتنے بڑے کارنامے انجام دیے ہندوستان میں لوگ ان سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔اخبارات میں اس بطل جلیل کے انتقال کی خبر تک نہیں آئی، کوئی وفیاتی نوٹ نہیں چھپے اس عالم بے بدل کے گزر جانے پر، اور ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم کو یہ توفیق ہوئی کہ آج ہم ان کو اور ان کی خدمات کو یاد کر رہے ہیں۔

ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گزار ہیں کہ اس نے اپنے بندے کو توفیق دی اتنا کچھ کرنے کی اور ہم کو توفیق بخشی کہ ہم یہاں جمع ہو کر اس کا ذکر کریں۔اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کے درجات کو بلند کرے، ان کی تمام خدمات کو قبول فرمائے اور ہم سب کو ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے اور کتاب اللہ اور سنت رسول کی حفاظت اور اس کے لیے زبانی نہیں، بیٹھ کے کمروں میں نہیں بلکہ اس کے لیے جو پتہ ماری کرنی پڑتی ہے، اس کے لیے جو جگر کو پانی کرنا پڑتا ہے جو محنت کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے اس کام کے کرنے کی ہمارے نوجوانوں کو توفیق دے۔اس لیے کہ یہی ہیں اب، انھیں سے امیدیں وابستہ ہیں اس لیے کہ لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا، ہم لوگ تو اب کسی اور راہ کے راہی ہیں۔آپ کی ذمہ داریاں اور خاص طور سے جن حالات کی طرف پروفیسر عبدالرحیم قدوائی نے اشارہ کیا، ان کے تناظر میں بہت بڑھ گئی ہیں۔حالات بدلتے رہتے ہیں، ہماری تاریخ ایسے حالات کے تذکرے سے بھری ہوئی ہے۔ایسے وقت بھی آئے ہیں جب لگتا تھا کہ اب اسلام کا سورج غروب ہو چکا ہے اور دوبارہ طلوع نہیں ہوگا، اس امت کا وقت اب ختم ہو چکا اب دوبارہ زندہ نہیں ہوگی لیکن پھر ہم سنبھلے اور پھر اٹھ گئے اور پھر دنیا کو بہت کچھ دیا 'تلك الايام نداولها بين الناس' وقت ایسے ہی گھومتا رہتا ہے۔البتہ جو لوگ وقت کی نبض کو پہچانیں اور جو لوگ وقت کی رفتار کو پہچانیں اور وقت کے تقاضوں کو پورا کریں۔اور وہ ٹھان لیں کہ ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مرمٹ جائیں گے، تو وہ وقت کے رخ کو موڑ دیتے ہیں۔جہاں اتنے اور ایسے نوجوان موجود ہیں اور چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں، جن کے دل میں اسلام کا درد ہے۔جو اللہ کی کتاب سے محبت رکھتے ہیں جو اس کے رسول کی سنت کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے جان دینے کے لیے تیار ہوں، ان کے ہوتے ہوئے اس ملک مں اس مذہب کا، اس کے مشن کا ستارہ ان شاء اللہ غروب نہیں ہوگا! البتہ اس کی ایک قیمت ہے اس قیمت کو ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تو یہ وقفہ بڑھتا جائے گا۔لیکن کمر کس کے کھڑے ہو جائیں گے تو وہ ختم ہو جائے گا۔اس لیے کہ کتنی ہی لمبی کوئی سرنگ ہو اس کے اختتام پر روشنی ہوتی ہے۔کیسی ہی گھنی تاریکی ہو اس کے بعد صبح ہوتی ہے، ان شاء اللہ وہ صبح ہوگی، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی جیسی شخصیت اور آپ جیسے لوگ موجود ہیں۔وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆

□ نقطۂ نظر

کثیر جہتی تہذیب اور افکارِ سعید نورسی

ندیم احمد انصاری
شعبۂ اردو، اسماعیل یوسف کالج، ممبئی

شیخ بدیع الزماں سعید نورسی نے خلافتِ عثمانیہ کے آخری دور میں زندگی گزاری۔ ان کی ولادت ترکی کے ایک گاؤں نورس میں ۱۲۹۴ھ ۱۸۷۷ء میں ہوئی تھی۔ ان کی پوری زندگی بالخصوص ۱۹۲۶ء کے بعد سے وفات (مارچ ۱۹۶۰ء) تک تقریباً تیئیس سال جہدِ مسلسل اور گہری فکر ونظر میں بسر ہوئی۔ ان کی تحریروں میں اہلِ وطن کے لیے اپنائیت کا جذبہ موجزن ہے اور یہ تحریریں کثیر جہتی تہذیب کو توانا کرتی نظر آتی ہیں۔ وہ بہ یک وقت میدانِ عمل کے غازی اور دین ووطن کے لیے مخلص سرفروشی کی تمنا رکھنے والے گرم جوش مفکر تھے۔ ان کا زمانہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی پر مشتمل ہے، جو کہ دورِ جدید کا نہایت اہم مرحلہ ہے۔ شیخ نورسی کی تحریروں میں موجود افکار کثیر جہتی تہذیب کے پودے کو توانائی بخشتے ہیں، اور ان کی تحریریں تنگ نظری، تعصب اور تشدد سے دور نظر آتی ہیں۔ انھوں نے ساری زندگی حق کا علم بلند رکھا، جس کے لیے انھیں ربع صدی تک زنداں کی صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

شیخ نورسی کا بڑا کارنامہ ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے 'رسائلِ نور' اور لاکھوں کی تعداد میں تربیت یافتہ طلبۂ نور ہیں، بلکہ جدید ترکی میں اسلامی بیداری انھیں کی مرہونِ منت ہے۔ رسائلِ نور میں مذہبی موضوعات کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی وسیاسی مسائل پر جابہ جا رہنمائی ملتی ہے۔ شیخ نورسی نے اپنی تحریروں سے حیاتِ انسانی کو نئی روشنی عطا کی اور کمیونزم کے دور دورے میں بھی لوگوں کے قلوب و اذہان میں روحانی و وجدانی زندگی کے خوابیدہ انسانی پہلوؤں میں تحریک پیدا کرنئی روح پھونکی۔ انھوں نے اُخروی پہلوؤں کے حامل مضبوط تعلقات کو منظرِ عام پر لانے کی تگ و دو کی اور خانقاہوں و مدارس کی برکات سے ایک ایسے نامسعود دور میں عوام کو روشناس بلکہ سرفراز کیا جس میں فنون وفلسفے کا غلط استعمال کر کے انسانیت کو الحاد کی طرف دھکیلنے کی پیہم کوششیں کی جارہی تھیں۔

شیخ نورسی کا ماننا ہے کہ مذہب ایک درخشندہ اور کائناتی حقائق کا مجموعہ ہے، جس کی چمک میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہ اپنی حکمرانی تمام زمان ومکان تک وسیع کرتا ہے۔ اسی لیے انھوں نے نہ صرف مذہب کی محدود اور تنگ نظر تعبیر وتشریح کے طور طریقوں کی شدت سے مخالفت کی بلکہ ٹھوس اور پختہ اقدام کے طور پر اس کی عالمانہ اور کثیر الجہات تعبیریں بھی پیش کیں تاکہ مذہبی حقائق کی شعائیں انسانی دل ودماغ تک پہنچ سکیں۔ اس طرح انھوں نے انتہا پسندی سے دوری اختیار کرتے ہوئے مذہب کی حقیقت تک پہنچنے کا ایک مختصر، محفوظ اور لچک دار راستہ اپنایا۔[۱]

شیخ نورسی کا نقطۂ نظر شمولیت پسندی، وسیع ظرفی اور غیر جانب دارانہ رویے پر مشتمل ہے، یہی وجہ ہے کہ ایسے ماحول میں جب کہ

مغرب اور اس کی تہذیبی برتری کو دین داری کی سب سے بڑی علامت تصور کیا جانے لگا، شیخ نورسی کی فکر میں قرآن کے تصورِ عدل کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

يَـا أَيُّهَـا الَّـذِيـنَ آمَـنُـواكُـونُوا قَوَّامِينَ لِلّـهِ شُهَدَاء بِالْقِسْطِ، وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا۔[۲]

اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔

شیخ نورسی نے اس ہدایت پر پورا پورا عمل کیا اور ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کی کوشش کی جس میں انتہا پسندی کو باریابی نصیب نہ ہو۔ اس کے علاوہ انھوں نے انسان کے اخلاق پر خصوصی توجہ مبذول کی، اس لیے کہ انسان کا انفرادی طور پر بھی محاسنِ اخلاق سے مزین ہونا سماج و معاشرے کے حسن کی ضمانت ہے۔ جس سماج کے افراد کے اخلاق عمدہ نہ ہوں، اس سماج کی عمدگی کے بارے میں سوچنا بھی محض خام خیالی ہے اور اخلاق کی درستگی میں اعمال کی جزا و سزا کو بڑا دخل ہے۔ جو معاشرہ جزا و سزا سے ناامید و بے خوف ہوتا ہے، اس میں سلامتی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔ شیخ نورسی کے مطابق:

''مرنے کے بعد کا عقیدہ زندگی کے استحکام کا سبب بنتا ہے، ورنہ سماجی زندگی بحران کا شکار ہو جاتی ہے۔ سماج میں بچّے ہیں، جوان ہیں، بوڑھے ہیں اور سماج کی اکائی خاندان ہے۔ جنت کا عقیدہ اگر نہیں ہوتا تو موت کو دیکھ کر بچوں پر برے اثرات پڑتے، وہ ڈر جاتے۔ اسی طرح یہ آخرت کی ابدی زندگی کا نظریہ ہی ہے جو بوڑھوں کو مایوسی سے بچاتا ہے، اور اسی طرح جہنم کا عقیدہ ہی ہے جو نوجوانوں کو ظلم کرنے اور فتنہ و فساد پھیلانے سے روکتا ہے۔ خاندان جو کہ ایک چھوٹی سی دنیا کی طرح ہے، اس میں حقیقی و سچی عزت، محبت، ہمدردی، قربانی تب ہی قائم رہ سکتی ہے جب خاندان کے سبھی افراد یہ یقین رکھیں کہ وہ ایک ابدی رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔''[۳]

اس اقتباس میں نہایت اعلیٰ و بلند خیالی کے ساتھ اسلامی تعلیمات اور عقیدۂ آخرت کو کثیر جہتی تہذیب کی صلاح و فلاح سے جوڑ کر عظیم پیغام دینے کی کوشش کی گئی اور یہ بتایا گیا ہے کہ صرف آخرت کا عقیدہ ہی ہے، جو دنیا کو جہنم بننے سے بچا سکتا ہے۔

شیخ نورسی نے ایک مفکر کی طرح مسائل کے حل کی تلاش اور ایک ماہر طبیب کی طرح امراضِ قوم کی تشخیص و علاج کا نازک کام انجام دیا ہے اور قوم کے فکری اضمحلال اور معاشرتی پریشانیوں کو دور کرنے کی تدبیریں کی ہیں۔ انھوں نے پرشکوہ مگر زوال پذیر ریاست کو اس کے طویل اور زرخیز ماضی سے سبق سیکھنے کی ترغیب دی ہے، کیوں کہ انھوں نے خلافتِ عثمانیہ کے زمانے سے ہی ملک کے طول و عرض میں دورے کیے تھے اور بڑے بڑے شہروں اور دور دراز دیہاتوں میں یہ مشاہدہ کیا تھا کہ لوگ جہالت کی تاریکی میں غرق ہونے کے باوصف مختلف النوع اختلافات میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کو نہ صرف زیر کرنے بلکہ کھسوٹ ڈالنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اسی کے پیشِ نظر انھوں نے قوم میں علم کی ضیاپاشیاں عام کرنے کی طرف توجہ دی اور غربت، ضرورت اور معیشت کے مسائل کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔

شیخ نورسی نے فرقہ واریت کے تدارک کے لیے وحدتِ امت کا علم بلند کیا اور ترکی میں اسلامی خلافت کے خاتمے کی اصل وجہ خود ساختہ قوم پرستی کو قرار دیا، جس کے لیے انھوں نے اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے استنباط و استدلال کیا۔ انھوں نے قومیت کا اسلامی تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ تمام مذاہبِ عالَم میں صرف اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے ہر کام میں نہایت اعتدال قائم رکھا ہے۔ اسلام سے قبل دنیا میں ظلم و جبر اور ذات

پات، رنگ ونسل کا امتیاز رائج تھا، حتّٰی کہ جرائم کی سزائیں بھی شخصیات وخاندان کے تفاوت سے مختلف ہوتی تھیں، لیکن جب رب العالمین نے رحمۃ للعالمین کو دنیائے انسانیت کی طرف بھیجا اوراعلان فرمایا:

خلقكم من نفس واحدة.[۴]

یعنی تمھیں ایک ہی ذات سے پیدا کیا ہے۔

اوراس کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبے میں ارشاد فرمایا:

يـايهـا الـنـاس! الا، ان ربكم واحد، وان اباكم واحـد، الا! لافـضـل لـعـربى على عجمى، ولا لعجمى عـلـى عـربـى، ولا لأسـود على احمر ولا لأحمر على اسود الا بالتقوى.[۵]

اے لوگو، غور سے سن لو! تمھارا رب ایک ہے اور تمھارا باپ ایک ہے۔ خبردار! کسی عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر یا کالے کو سرخ پر اور سرخ کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے۔

اور خاندانی امتیازات کے مقصد اور غرض وغایت کو واضح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا:

يَـا أَيُّهَـا الـنَّـاسُ اِنَّـا خَـلَقْنَـاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثٰى وَجَـعَـلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا، اِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ.[۶]

لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت (یعنی ایک ماں باپ/آدم وحوا) سے پیدا کیا اور تمھاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے، جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ليس منا من دعا الى عصبية ، وليس منا من قاتل على عصبية، وليس منا من مات على عصبية.

وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے اور اس کی آواز بلند کرے، وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی وجہ سے جنگ کرے، وہ ہم میں سے نہیں جس کی موت عصبیت پر آئے۔[۷]

یعنی اس حال میں مرنا کہ اس کے دل میں علاقائی، لسانی، خاندانی، قبائلی، ملکی، قومی، مسلکی یا کسی بھی طرح کی عصبیت پائی جاتی ہو، اسے اسلام نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ہاں یہ ضرور واضح کر دیا کہ کسی کے تئیں کسی خاص تعلق سے نرم گوشہ رکھنا اس مذمت میں داخل نہیں۔

عَـنْ عَبَّـادِ بْـنِ كَثِيـرٍ الشَّامِيِّ عَنْ امْرَأَةٍ مِنْهُمْ يُقَالُ لَهَـا فُسَيْـلَةُ قَالَتْ سَمِعْتُ أَبِي يَقُولُ سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰـهُ عَـلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللّٰهِ: أَمِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُـحِبَّ الرَّجُلُ قَوْمَهُ؟ قَالَ: لَا وَلٰكِنْ مِنَ الْعَصَبِيَّةِ أَنْ يُعِينَ الرَّجُلُ قَوْمَهُ عَلَى الظُّلْمِ.[۸]

عباد بن کثیر شامی سے روایت ہے، حضرت فُسیلہ فرماتی ہیں، میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے ہوئے سنا؛ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا یہ بھی تعصب ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں یہ تعصب نہیں بلکہ تعصب یہ ہے کہ آدمی (ناحق اور) ظلم میں بھی اپنی قوم کا ساتھ دے۔

یہ وہ اسلامی اصول واقدار ہیں، جن پر شیخ نورسی ہمیشہ کاربند رہے اور انھیں باتوں کو اپنے لٹریچر میں پیش کیا۔ ملاحظہ ہو مذکورہ مسائل کو وہ کس چابک دستی سے بہ طور نظریہ صحیح فکر کے ساتھ پیش کرتے ہیں، وہ پوری قوت کے ساتھ کہتے ہیں:

''نسلی قوم پرستی کی بنیاد پر قوموں کے درمیان اختلاف اور دشمنی پیدا کرنا، تباہی وبربادی کی دعوت دینا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص

مکھی سے بچنے کے لیے اپنا پاؤں زہریلے سانپ پر رکھ دے۔''[۹]

قوم پرستی کی صحیح تعریف بیان کرتے ہوئے ، ایک مقام پر وضاحت کے ساتھ کہتے ہیں:

''دوسری قسم مثبت قوم پرستی کی ہوتی ہے اور اجتماعی وجود قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ قوم پرستی باہمی امداد، مفاہمت اور استحکام کا ذریعہ ہو، اس سے حاصل ہونے والی طاقت مفید اور اسلامی اخوت کو عملی جامہ پہنانے کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔''[۱۰]

مختصر یہ کہ شیخ نورسی نے اسلامی تعلیمات کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ عصبیت کے نشے میں کسی پر ظلم کرنا یقیناً مذموم ومبغوض ہے، جس کی اسلام نے کبھی اجازت نہیں دی، خواہ موقع بہ موقع مذہبِ اسلام کو اس سے متّہم کیا جاتا رہا ہو۔ یہ شریروں کی شرارت کے سوا کچھ نہیں کہ باوجود ایسی پاکیزہ تعلیمات کے وہ اسلام پر الزامات عائد کرتے ہیں۔ اسی لیے عالمی پیمانے پر اسلام اور مسلمانوں کی بابت جو غلط فہمیاں پھیلائی جاتی ہیں، ان کا ازالہ کرتے ہوئے شیخ نورسی دوٹوک الفاظ میں رقم طراز ہیں:

''ہم نور اسکول کے طلبہ نے قرآن سے یہ سیکھا ہے کہ قرآن کا تصورِ عدل ہمیں اس بات کی ممانعت کرتا ہے کہ ہم اس ناؤ کو جلائیں جس میں دس قاتل اور ایک بے قصور شہری سوار ہیں، کیوں کہ اس بے قصور کے حقوق کی حفاظت ہمارا فرض ہے، تو پھر کیا کوئی شخص اس ناؤ یا گھر کو جلا سکتا ہے جس میں دس بے قصور اور ایک مجرم موجود ہے؟ کیا یہ ظلم و ناانصافی نہیں ہے۔ ہم تہِ دل سے معاشرے میں امن و امان برقرار رکھنے کے متمنی ہیں، تاکہ کچھ مجرموں کی وجہ سے بہت سے بے قصور لوگوں کی جان و مال خطرے میں نہ پڑے۔''[۱۱]

اس اقتباس میں رواداری و بردباری کا جو سبق دیا گیا ہے، دراصل یہی وہ پیغام ہے جس سے کثیر جہتی تہذیب کو بقا و دوام حاصل ہوسکتا ہے اور جس سے جہالت، تنگ نظری اور شدت بلکہ انتہا پسندی کا خاتمہ ہوتا ہے جو کہ تمام تر فسادات کا سرچشمہ اور فرقہ بندی کا سبب ہے، ضرورت ہے کہ اسلام اور شیخ نورسی کے اس پیغامِ عالی شان کو عام کیا جائے۔

☆☆☆☆

حوالہ جات:

[۱] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۳

[۲] سورۃ المائدہ:۸

[۳] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۳۸، ۳۹

[۴] سورۃ النساء:۱

[۵] تفسیر القرطبی:۲۹۳/۱۶

[۶] سورۃ الحجرات:۱۳

[۷] صحیح مسلم، برقم:۱۸۴۸، ۱۴۷۶

[۸] سنن ابن ماجہ، برقم:۳۹۴۹

[۹] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۰۵

[۱۰] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۰۵، ۱۰۶

[۱۱] معلمِ عصر سعید نورسی، البلاغ پبلکیشنز، دہلی، ۲۰۱۵ء، ص:۹۷

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

جنسی نشو نما:

جنسی نشونما کے موضوع پر گفتگو کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس لیے کہ عام طور پر لوگ اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے یا تو شرماتے ہیں یا پریشانی محسوس کرتے ہیں، اہل خانہ عام طور پر اپنے بچوں سے ہر موضوع پر بات کر لیتے ہیں سوائے جنسی مسائل اور مخصوص اعضا کے، ان سے متعلق گفتگو کرنا محال ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جنسی نمو بچہ کا اپنے آپ کو پہچاننے، اپنے اعضاء کو جاننے اور اپنے احساسات سے واقف ہونے کا حصہ شمار کیا جاتا ہے، اس سے متعلق امور اس اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں کہ اگر بچے کی ابتدائی زندگی میں اس سے کچھ غلطیاں سرزد ہو جائیں تو اس کی شخصیت پر اس کے منفی اثرات پڑتے ہیں اور اس کی آئندہ زندگی بھی متاثر ہوتی ہے۔

ہماری دینی تعلیمات اور اسلامی تہذیب کا اس سلسلے میں موقف معتدل ہے، اس میں نہ تو بلا حدود و قیود ہر چیز جائز ہے اور نہ اس کے برعکس انسان کی فطرت اور اس کی طبیعت کو کچلنے کی کوشش کی گئی ہے، ان دونوں کے الگ الگ نقصانات ہیں، ضروری نہیں کہ جنس کے متعلق ہر بات گندی اور ردی ہو، اسلامی زندگی میں جنس کا مسئلہ ایک ضروری حس اور فطری تقاضے کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے، وہ ایک انسانی صفت ہے، وہ ایک ایسی حس ہے جس کو اخلاق قابو میں کرتا ہے، اس کے نمو اور کیفیت پر سماجی ماحول اثر انداز ہوتا ہے۔

اگر بچہ جسمانی نمو سے واقف نہیں ہوتا ہے بالخصوص جب وہ بلوغ کے مرحلے میں پہنچتا ہے اور جسمانی تطورات سے لاعلم ہوتا ہے، تو وہ دوسروں سے سنی سنائی باتوں اور اوہام وخرافات کا شکار ہو جاتا ہے، کبھی کبھی اس ناواقفیت کی وجہ سے دوسروں کی زیادتی کا بھی شکار ہو جاتا ہے، جو اس کے لیے تکلیف و پریشانی کا سبب بن جاتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بچے کا تعاون کیا جائے اور اس کو سمجھایا جائے کہ وہ اپنی ذات اور جسمانی نمو اور جنسی تطورات کو انسانی زندگی کے ایک جز کی طرح قبول کرے، جنسی معاملہ انسانی زندگی کا ایک جز ہے جس کو اخلاقی، معاشرتی اور صحیح دینی رویہ کے ذریعہ منظّم کیا جاتا ہے وہ انسانی زندگی کا ایک منظّم حصہ ہے، البتہ اللہ نے اسے انسان کے لئے جسمانی لذتوں کا سرچشمہ بھی بنایا ہے، "وفی بضع أحدكم صدقة" یعنی شرم گاہ کا جائز وحلال استعمال باعث ثواب ہے۔

یہ غلط بات ہے کہ بچہ اس طرح پروان چڑھے کہ وہ اپنے جسم کے کسی ٹکڑے کو قبیح اور مکروہ سمجھتا ہو، بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے نفس اور اپنے جسم کو قبول کرتا ہو اور اپنے اندر وقار رکھتا ہو اور عفت اور نفس پر قابو رکھنے کی صفت سے اس طرح سے آراستہ ہو جس طرح دین رہنمائی کرتا ہے اور اخلاق جس کی تعلیم دیتا ہے۔

اگر ہم بچے کو یہ سکھا دیں گے کہ جنسی دوافع وخیالات اور جنسی نمو کے مظاہر قبیح امور ہیں تو اس سے اس کا جسمانی اور جنسی نمو رکے گا نہیں البتہ وہ ان چیزوں کے اظہار سے گریز کرے گا، اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا کہ جنسی خیالات اس کے اندر موجود نہیں ہیں، حالانکہ اس طرح کے احساسات اس کے ذہن وفکر میں سمائے ہوئے ہوں گے، پھر اندرونی طور پر وہ اپنی طبیعت اور جنسی خیالات نیز ان کے انکار و عدم اظہار کے مطالبے کے درمیان کشمکش سے دو چار ہوگا، حالانکہ جنسی احساس انسانی زندگی میں بہت طاقتور ہوتا ہے، اگر اس کو صحیح رخ نہ دیا جائے تو انسان بڑی تکلیف اور عدم استحکام اور بے چینی کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔

خود والدین کو جنسی مسائل کے متعلق اپنے موقف کا جائزہ لینا چاہیے، اگر وہ خود اس کو قبیح ومکروہ سمجھتے ہیں تو غیر شعوری طور پر وہ یہی احساس اپنے بچے میں منتقل کریں گے، اور ظاہر ہے کہ والدین کا موقف معلومات پر مبنی ہوتا ہے جو بچپن میں انھوں نے سیکھا ہے، اور زندگی کے مختلف مراحل میں جن تجربات سے وہ گزرے ہیں اور

معاشرے میں دوسروں سے جو کچھ سیکھا ہے۔

شریف اور مثقف گھرانے اپنے بچوں کو ایسے اخلاقی قواعد وضوابط سکھاتے ہیں جو جنسی رجحانات کو قابو میں کرتے ہیں اور ان رجحانات کی تعبیر کا اسلوب بتاتے ہیں، اس سلسلے میں معاشرے کی دینی اور تہذیبی اقدار بھی اپنا کردار ادا کرتی ہیں، لیکن یہ ملحوظ رہے کہ جس بچے کو اخلاقی قواعد وضوابط سکھائے جاتے ہیں اور صحیح دینی معلومات کے ساتھ اس کے جسم اس کی زندگی اور جنسی احساسات کے متعلق صحیح معلومات فراہم کی جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں انداز میں والدین کے ساتھ اسے ان امور پر مذاکرنے کا موقع ملتا ہے تو اس میں اور اس بچے میں فرق ہوتا ہے جس کے دماغ میں فتور وخرافات بھرا ہوا اور جو اس سلسلے میں اساطیری خیالات کا شکار ہو، یہ سب لازمی نتیجہ ہوگا اس کا کہ اس کو ان امور پر گفتگو کرنے اور جنسی مسائل میں غور وفکر کرنے سے منع کر دیا گیا تھا۔ اسی طرح ان بچوں میں بھی فرق ہوتا ہے جن کو اخلاقی اقدار کو سمجھ کر اور ہضم کر کے برتنے پر حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور ان بچوں کے درمیان جو بغیر سمجھے ہوئے ہی اخلاقی اصولوں کی پابندی کرتے ہیں۔

جنسی تربیت: جنسی احساس بذات خود کوئی معیوب اور شرمناک چیز نہیں ہے، بلکہ درحقیقت یہ نعمت ہے جو فطری طور پر اللہ نے انسان کو مرحمت فرمائی ہے تاکہ نسل انسانی باقی رہ سکے، ارشاد باری ہے وإذ قال ربك للملٰئكة إلى جاعل فى الأرض خليفة (البقرہ: ۳۰) لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اس جنسی احساس کا کیا کریں؟ ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں وہ بہت پیچیدہ ہے، اس معاشرے میں جنسی معاملات کو برتنا انتہائی مشکل عمل ہے، صورت حال یہ ہے کہ تہذیب باختہ اور حیا سوز معاشرے میں ''جنس'' کا ہر چیز میں مظاہرہ ہو رہا ہے حتی کہ اشتہارات واعلانات بھی اس سے بری نہیں رہ گئے، اس طرز عمل نے لوگوں میں جنسی ہیجان برپا کر دیا ہے، اس کے برعکس دوسری طرف وہ معاشرہ ہے جس میں جنسی معاملات میں صراحت درست نہیں، حتی کہ وہاں ان امور پر گفتگو کرنا بھی درست نہیں سمجھا جاتا، بلکہ ان امور کو پردۂ خفا میں رکھا جاتا ہے، مذکورہ دونوں صورتوں میں اس موضوع پر از سر نو نظر ڈالنے کی ضرورت ہے، جنس انسانی زندگی کا ایک طاقتور حصہ ہے، اس کا اپنا کردار ہے، اس کے لیے اصول وضوابط ہیں، چنانچہ جو اس سلسلے میں نظم وضبط کا خیال نہ رکھے گا وہ ہلاک ہوگا، جنس ہی مرد وعورت کے درمیان میاں بیوی کی حیثیت سے ربط وتعلق کا سبب ہے، جس میں محبت ورحمت جاگزیں ہوتی ہے اور یہ تعلق اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے، ارشاد باری ہے ومن آياته أن خلق لكم من أنفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة (روم:۲۱)

بعض لوگ جنس یا جسمانی تلذذ کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں، اسکے بالمقابل بعض لوگ اس کو انسان کی تمام مشکلات کا سبب شمار کرتے ہیں، اس لیے ہم کو کوئی حیرت نہیں کہ معاشرے میں اس طرح کی کشمکش پائی جاتی ہے کہ ایک طرف تو جنس سرکشی، انانیت اور بے راہ روی کا سبب ہے تو دوسری طرف اس کو گندی اور شرمناک چیز سمجھا جاتا ہے۔

فطری بات ہے کہ بچہ جنس کے موضوع پر بے جھجک بات کرے گا اور بڑوں کے یہاں جو پیچیدگیاں پائی جاتی ہیں ان کی پروا نہیں کرے گا، اس سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے جذبے کے ساتھ ہی وہ اپنے جسم اور اس سے متعلق اپنے احساس پر بھی توجہ دینا شروع کر دے گا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جنس پر توجہ کی ابتدا اچانک نہیں ہوتی بلکہ آہستہ اور بتدریج ہوتی ہے، اس لیے بہتر یہ ہے کہ جب بچہ جنس اور اعضاء جنسیہ کے متعلق سوالات کرنا شروع کرے تو والدین اس کو جواب دیں، اس ابتدائی مرحلہ میں یہ شروعات بچے اور والدین دونوں کے لئے مفید ہے، اس لیے کہ اگر والدین نے جواب نہ دیا تو جب بچہ بڑا ہو جائے گا تب انھیں یہ باتیں بتانے میں شدید دشواری ہوگی، چنانچہ بچے کی فہم کے مطابق آسان اسلوب میں اسکو تین سال کی عمر میں جو بات سمجھانا ممکن ہے، وہی بات اس کو تیرہ سال کی عمر میں سمجھانا ممکن نہ ہوگا، والدین کو کوشش کرنا چاہیے کہ وہ بچے کو اس کی عمر اور نمو کے اعتبار سے صحیح معلومات فراہم کرنے میں اس کی مدد کریں، اور اس کو سمجھائیں کہ وہ ان معلومات کو بھی ویسے ہی قبول کرے جیسے زندگی کے دوسرے امور سے متعلق معلومات کو قبول کرتا ہے، اس کا ایک لازمی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ بچہ اپنے والدین کے ساتھ کھل کر گفتگو کرنا بھی سیکھے گا۔

☆☆☆

(.....جاری)

❑ انکار حدیث

استاد احمد امین اور حدیث پر اعتراضات

تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

استاد احمد امین صاحب کے کچھ اور اعتراضات اور ان کے جوابات پیش ہیں:

عدالت صحابہ: اسناد احمد امین صاحب نے ۲۶۵ پر لکھا ہے کہ ''اکثر ناقدین حدیث تمام صحابہ کرام کو عدول مانتے ہیں، اور ان پر کسی طرح کی جرح نہیں کرتے، خاص کر متاخرین نقاد، البتہ بعض ناقدین صحابہ کو بھی جرح وتعدیل کا نشانہ بناتے ہیں''۔

یہاں بھی انھوں نے فریب سے کام لیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ''اہل اسلام صحابہ کی عدالت وثقاہت پر متفق ہیں، نہ متقدمین میں کوئی ایسا ہے جس نے صحابہ کو متہم کیا ہو اور نہ متاخرین میں۔

اور جن لوگوں نے صحابہ کرام کے بارے میں کلام کیا بھی ہے تو ان کا تعلق شیعہ، معتزلہ اور خوارج سے ہے، جنہوں نے اپنے مخصوص عقائد کی بنا پر بعض صحابہ کی جرح کی، لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں۔ اور پھر ان کا شمار ناقدین حدیث میں بھی نہیں ہے، اور یہاں ذکر ناقدین کا ہی ہو رہا ہے۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ احمد امین نے اپنی اس بات کے اثبات میں امام غزالی کی ایک عبارت سے استشہاد کیا ہے، حالانکہ امام غزالی کا صاف وصریح عقیدہ ہے کہ ''صحابہ کے عادل ہونے پر جمہور علمائے سلف وخلف کا اجماع ہو چکا ہے''۔

کیا صحابہ ایک دوسرے کی تکذیب کرتے تھے ؟: احمد امین نے اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ آگے چل کر انہوں نے یہاں تک لکھ دیا کہ خود صحابہ کرام بھی ایک دوسرے کی تنقید کرتے تھے، اور بعض کو بعض سے افضل قرار دیتے تھے۔

صحابہ کے ایک دوسرے پر تنقید کرنے کے سلسلے میں موصوف نے تین باتوں سے استدلال کیا ہے:

۱۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ پر نقد کیا تھا۔

۲۔ بعض صحابہ جب کوئی حدیث سنتے تو راوی سے اس کی صداقت کی دلیل طلب کرتے۔

۳۔ وہ واقعہ جو حضرت عمر فاروقؓ اور فاطمہ بنت قیس کے درمیان پیش آیا۔

حقیقت امر: یہ بھی ڈاکٹر صاحب کا بے بنیاد دعوی ہے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ ایک دوسرے کے صادق ہونے میں ذرا بھی شک نہ کرتے تھے، اور ایک دوسرے کی روایت کو بلا چوں چرا تسلیم کر لیا کرتے تھے، حضرت انس فرماتے ہیں: ''ہم ایک دوسرے کو جھٹلاتے نہ تھے''۔ اسی طرح حضرت براء کا قول ہے: ''ہم نے ساری حدیثیں براہ راست رسول اللہ ﷺ سے نہ سنی تھیں بلکہ آپ کے صحابہ ہمیں حدیثیں سنایا کرتے تھے (اور ہم انہیں روایت کیا کرتے تھے)۔

ڈاکٹر صاحب نے جن تین باتوں سے استدلال کیا ہے، ان کا جواب ترتیب وار درج ہے:

۱۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ پر جو نقد کیا تھا، اس کا تفصیلی جواب حضرت ابو ہریرہؓ کے ذکر میں آئے گا، خلاصہ یہ ہے کہ اس کا فہم کا اختلاف تھا نہ ایک دوسرے کی تکذیب وتردید۔

۲۔ یہ بات کہ بعض صحابہ راوی سے دلیل طلب کرتے تھے، تو حقیقت یہ ہے کہ ایسا خاص مواقع پر ہوا تھا، ورنہ عمومی حالت یہی تھی

کہ وہ ایک دوسرے کی روایات بلا دلیل قبول کر لیا کرتے تھے، تاریخ کی کتابیں اس پر شاہد ہیں، ہاں چند مواقع پر ایسا ہوا، مثلاً حضرت عمرؓ نے حضرت ابوموسی اشعریؓ سے اور حضرت صدیقؓ نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے دلیل طلب کی، تو اس کی حکمت ہم پیچھے بیان کر چکے ہیں، کہ ان حضرات نے ایسا اس لیے کیا تا کہ لوگ روایت کرنے میں بے احتیاطی نہ کرنے لگیں''، بلکہ انھیں اس بات کا بھی خوف رہے کہ اگر ہم غلط سلط روایات کریں گے تو ہم سے دلیل طلب کی جاسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰؓ سے کہا تھا: ''میں جانتا ہوں کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نہایت امین ہیں، لیکن میں نے یہ اس لیے کیا تا کہ لوگ روایت کرنے میں بے جا جرأت نہ کرنے لگیں۔

۳۔ حضرت فاطمہ بن قیسؓ کا واقعہ یہ تھا کہ انھیں ان کے خاوند نے طلاق دی، تو رسول اللہ ﷺ نے انہیں شوہر سے نفقہ اور سکونت نہیں دلوائی، اور انھیں عبد اللہ بن ام مکتوم کے یہاں ایام عدت گذارنے کا حکم دیا، جب حضرت عمرؓ کے زمانے میں انھوں نے یہ بات حضرت عمرؓ کو بتائی تو حضرت عمرؓ نے ان کی بات تسلیم نہ کی اور فرمایا: (آگے کے الفاظ احمد امین کے نقل کردہ ہیں)

''ہم ایک عورت کی وجہ سے کتاب خدا اور سنت نبوی کو ترک نہیں کر سکتے، ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے سچ کہا یا جھوٹ، اور اسے آپ ﷺ کی بات یاد رہی یا بھول گئی، حضرت عائشہؓ نے اس عورت سے کہا: کیا تم اللہ سے نہیں ڈرتیں؟''۔

جواب: اس حدیث کے بارے میں کئی اعتبار سے بحث کی جاسکتی ہے:

۱۔ یہ سب جانتے ہیں کہ صحابہ کرام فہم اور قوت استنباط میں یکساں نہ تھے، اس لیے بسا اوقات ایک ہی حدیث سے دو صحابہ الگ الگ مطلب سمجھتے۔ اسی طرح بسا اوقات آپ ﷺ کسی صحابی کے ساتھ خاص معاملہ فرماتے، اور وہ اس کو عام حکم سمجھ کر بیان کر دیتا، حالانکہ وہ حکم خاص ہوتا، نہ کہ ہر ایک کے لیے عام، اس طرح صحابہ کرام کے درمیان بسا اوقات کسی حدیث کو لے کر بحث ومباحثہ ہو جاتا، اس کی وجہ یہ نہ ہوتی کہ وہ ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں بلکہ وجہ یہ ہوتی کہ دونوں اپنی اپنی صلاحیت کے اعتبار سے الگ الگ مفہوم برآمد کر رہے ہوتے۔ صحابہ کرام کے حدیث کے سلسلہ میں جو باہمی مناقشات مذکور ہیں، سب اسی قبیل سے ہیں۔

۲۔ احمد امین کے بیان کردہ الفاظ ''ہمیں نہیں معلوم کہ اس نے سچ کہا یا جھوٹ کہا'' باوجود تلاش وتحقیق کے حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملے، سب کتابوں میں ''ہم نہیں جانتے کہ اس نے یاد رکھا یا بھول گئی'' کے الفاظ ہیں، احمد امین کے نقل کردہ الفاظ ''اصول فقہ کی بعض کتابوں میں ہے، چنانچہ مسلم الثبوت میں ان الفاظ کو مسلم کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے، حالانکہ مسلم میں یہ الفاظ کہیں بھی نہیں ہیں۔

اور مسلم الثبوت کے شارح نے اس پر تنبیہ بھی کی ہے کہ مسلم میں یہ الفاظ موجود نہیں، اب تعجب تو احمد امین پر ہے کہ انھوں نے حدیث کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے اصول فقہ کی ایک کتاب سے روایت کیوں نقل کی؟

۳۔ اور اگر بالفرض یہ الفاظ درست بھی مان لیے جائیں، تب بھی ڈاکٹر صاحب موصوف کو چاہئے تھا کہ انھیں ایسے مفہوم پر محمول کرتے، جو دوسری روایات کے مفہوم سے بھی میل کھاتا، یعنی ''کذب'' کو غلطی پر اور ''ملامت'' کو درستگی پر محمول کرتے اور اہل عرب کے یہاں کذب سے غلطی اور صدق سے درستگی کا مفہوم مراد لینا عام ہے۔

۴۔ حضرت عمرؓ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت اس لیے رد کر دی کہ ان کے پاس اس سے متعارض نص قرآنی تھی، جو اس روایت کے مقابلے میں زیادہ قوی ہے۔ اور حضرت عمرؓ نے اس روایت کے بارے میں یہ عذر پیش کر دیا کہ شاید ان سے بھول چوک ہوئی ہے۔

۵۔ حضرت عائشہؓ کا ''جملہ'' کیا تمہیں اللہ کا خوف نہیں'' اس پس منظر میں ہے کہ تم جانتی تھیں کہ تمہیں کو یہ اجازت خصوصی طور پر دی گئی تھی، یہ عام حکم نہ تھا، پھر تم نے اسے عام کیسے سمجھ لیا۔

جرح وتعدیل میں علماء کا اختلاف: احمد امین نے ص: ۲۶۶ پر لکھا ہے: ''رواۃ کی جرح وتعدیل میں مسلکی اختلاف کا بھی بڑا اثر پڑا، چنانچہ اہل سنت نے اکثر شیعہ رواۃ کو مجروح قرار دے دیا اور شیعہ نے بھی اکثر اہل سنت کا اعتبار نہیں

کیا۔اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک راوی ایک فرقے کے نزدیک ثقہ ہوتا ہے اور دوسرے کے نزدیک مجروح ہوجاتا ہے، ذہبی کا قول ہے:
''علماء جرح وتعدیل میں سے دو عالم بھی کبھی کسی راوی کو ثقہ یا ضعیف قرار دینے پر متفق نہ ہوئے''۔ اگر چہ یہ قول مبالغہ پر مبنی ہے مگر اس سے پتہ چلتا ہے کہ جرح وتعدیل میں علماء کے درمیان کس قدر اختلاف ہوتا ہے، اس کی موٹی مثال محمد ابن اسحاق کی شخصیت ہے''، اس کے بعد احمد امین صاحب نے ابن اسحاق کے بارے میں علماء کی مختلف آراء نقل کی ہیں کہ قتادہ اور سفیان انھیں ثقہ کہتے ہیں جبکہ دار قطنی، نسائی اور امام مالک انھیں نا قابل احتجاج قرار دیتے ہیں۔

حقیقت : یہاں دو امور قابل لحاظ ہیں:

۱۔ جرح وتعدیل کے قواعد کے بارے میں:

۲۔ ذہبی کی مذکورہ بالا عبارت اور محمد بن اسحاق کے بارے میں مختلف آراء۔

۱۔ موصوف کی باتوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ رواۃ کی جرح وتعدیل میں علماء کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے، اس کی وجہ ان کا مسلکی اختلاف ہے۔

حالانکہ یہ بات قطعاً درست نہیں، اس لیے کہ بہت سے رواۃ کی جرح وتعدیل میں خود علماء اہل سنت کے درمیان اختلاف ہوتا ہے، اب بتائیے کہ جب یہاں مسلکی اختلاف ہی نہیں، تو پھر جرح وتعدیل میں یہ اختلاف کیوں؟؟

اور جہاں تک بات ہے کسی راوی کی جرح وتعدیل میں اہل سنت اور دیگر فرقوں کے اختلاف آراء کی، مثلاً ایک راوی کو علماء شیعہ ثقہ قرار دیتے ہیں اور علماء اہل سنت اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، تو اس کی وجہ بھی مسلکی اختلافات نہیں، بلکہ ایسی وجوہات ہوتی ہیں جو واقعی میں اس کے مشکوک ہونے کا تقاضا کرتی ہی، چنانچہ اہل سنت مخالف فرقے کے راوی کو اسی وقت مجروح قرار دیتے ہیں، جب کہ اس کی بدعت کفر تک پہنچانے والی ہو، یا وہ صحابہ کی شان میں دست اندازی کرتا ہو، یا اپنی بدعت کی دعوت دیتا ہو یا اس کی روایت اس کے مخصوص مبتدعانہ افکار کی تائید کرتی ہو، لہذا انھیں ضعیف قرار دینے کی اصل وجہ ان کا مشکوک ہونا ہے نہ کہ محض کسی خاص فرقے سے تعلق رکھنا۔اس کی دلیل یہ ہے کہ اکثر کتب حدیث اور بالخصوص بخاری ومسلم میں بہت سے ایسے بدعتی فرقوں کی روایات لی گئی ہیں، جن کی ثقاہت مشکوک نہیں تھی، جیسے عمران بن حطان خارجی اور ابان بن تغلب شعبی، وغیرہ۔

اور حضرت علی سے شیعہ کی روایات قبول نہ کرنے کی وجہ کوئی مسلکی اختلافات نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حضرت علی کے بارے میں بہت جھوٹ بولا ہے جس کی وجہ سے ان پر سے اعتبار جاتا رہا اور وہ مشکوک ہوگئے ہیں۔

۲۔ جہاں تک ذہبی کی مندرجہ عبارت اور محمد ابن اسحاق کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال کی بات ہے، تو اس سلسلے میں ہم چند باتیں عرض کریں گے:

۱۔ مصنف جرح وتعدیل کی وجہ مسلکی اختلاف کو قرار دیتے ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے ابن اسحاق کو بطور مثال پیش کیا ہے، ان کی یہ بات سراسر غلط ہے، اس لیے کہ ابن اسحاق کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ خود علماء اہل سنت کے مابین ہے، اس لیے اسے اپنے مندرجہ بالا دعوی کی دلیل بنانا کسی طرح درست نہیں۔

۲۔ مصنف نے ذہبی کی عبارت کا مفہوم غلط سمجھا ہے، انھوں نے اس عبارت سے یہ سمجھا کہ جرح وتعدیل کے سلسلے میں بڑا شدید اختلاف ہوا ہے، شدت اختلاف کا عالم یہ ہے کہ دو شخص کسی راوی کو ضعیف قرار دینے پر متفق ہوئے اور نہ کسی کو ثقہ قرار دینے پر؛ بلکہ اگر ایک نے ثقہ قرار دیا تو دوسرے نے ضعیف ٹھہرا دیا۔

حالانکہ ذہبی کی عبارت کا یہ مطلب بالکل نہیں، اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ علماء جرح وتعدیل انتہائی حزم واحتیاط سے کام لیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی راوی ضعیف ہونے کے اعتبار سے معروف ہو تو اسے کبھی بھی دو لوگوں نے ثقہ قرار دینے پر اتفاق نہیں کیا، بلکہ سب نے ہی اسے ضعیف قرار دیا۔

۳۔ محمد بن اسحاق کے بارے میں جو اختلاف ہے، اس سے ذہبی کی مندرجہ بالا عبارت کی کسی طور تائید نہیں ہوتی، بلکہ اس سے تو خود اس عبارت پر اعتراض پیدا ہوجاتا ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ مسلم

الثبوت کے مصنف نے اس عبارت کو ذکر کیا ہے، اس پر شارح نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تعمیم صحیح نہیں ہے، اور یہ استقراء ناقص ہے، اس لیے کہ خود ابن اسحاق کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ اس عبارت کی تردید کرتا ہے، اس لیے کہ ''اگر ابن اسحاق کے ثقہ تھے تو بھی ان کو دو سے زیادہ لوگوں نے ضعیف قرار دیا ہے، اسی طرح اگر وہ ضعیف تھے تو بھی دو سے زیادہ نے انھیں ثقہ مانا ہے''۔

اصل بات یہ تھی، مگر احمد امین صاحب کو نہ تو صاحب مسلم الثبوت کا فہم اچھا نہ لگا نہ شارح کا اور نہ خود ذہبی کی مراد انہیں پسند آئی، اس لیے انھوں نے جلدی سے ان کی عبارت سے اپنا خود ساختہ مفہوم مراد لیا اور دلیل کے طور پر ابن اسحاق کو پیش کر دیا۔

سند ومتن کو جانچنے کے اصول: احمد امین صاحب نے ص:۲۶۶ پر لکھا ہے: ''علماء نے نقد سند پر جس طرح توجہ کی اتنی توجہ نقد متن پہ نہیں کی''۔

ان کا یہ الزام بھی سراسر بہتان ہے، مندرجہ ذیل تفصیل سے آپ اس کی حقیقت سمجھ سکتے ہیں:[

نقد حدیث کے کے سلسلہ میں علماء کے وضع کردہ اصول وقواعد: محدثین کے یہاں نقد حدیث کے دو مرحلے ہیں، نقد سند اور نقد متن۔

۱۔ نقد سند: محدثین نے نقد سند کے لیے جو شرطیں لگائی ہیں وہ پیچھے گذر چکی ہیں، جن میں سے اہم یہ ہیں:

(۱) راوی عادل ہو، (۲) تام الضبط ہو، (۳) سند میں اتصال ہو، یعنی اس نے اپنے شیخ سے براہ راست سنی ہو، (۴) اس میں علت نہ پائی جائے، (۵) وہ شاذ نہ ہو۔

سند کی تنقید اور رواۃ کی جرح وتعدیل میں محدثین نے جو سخت معیار قائم کیا، اس کا انکار تو احمد امین اور اس کے پیش رو مستشرقین نے بھی نہ کر سکے، اور حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جس اعلی درجے تک محدثین پہنچے ہیں، اس حد تک تو احمد امین اور اس کے پیش رو مشرقین کے لئے رسائی پانا ممکن نہ تھا۔

۲۔ نقد متن کے اصولوں میں سے چند اہم یہ ہیں:

(۱) حدیث ایسے رکیک الفاظ پر مشتمل نہ ہو جو کسی فصیح وبلیغ شخص سے صادر نہ ہو سکتے ہوں (۲) بدیہیات عقل کے مخالف نہ ہو، جس میں کسی تاویل کی گنجائش نہ ہو، (۳) حکیمانہ اقوال واخلاق کے مخالف نہ ہو، (۴) حس ومشاہدہ کے خلاف نہ ہو، (۵) بدیہیات طب وحکمت کے خلاف نہ ہو، (۶) اس میں ایسے رذائل نہ بیان کیے گئے ہوں جو شریعت کے منافی ہوں، (۷) بنیادی عقائد جیسے اللہ ورسول کی صفات سے متصادم نہ ہو، (۸) کائنات سے متعلق سنت الٰہی کے خلاف نہ ہو، (۹) ایسی دوراز کار باتوں پر مشتمل نہ ہو جن سے عقلاء کا دامن پاک ہوتا ہے، (۱۰) قرآن، محکمات سنت اور معروف واجماعی دینی امور کے خلاف نہ ہو، (۱۱) معروف تاریخی حقائق سے نہ ٹکراتی ہو، (۱۲) وہ حدیث اس بدعت کی تائید نہ کرتی ہو جس کی طرف اس کا راوی دعوت دیتا ہو، (۱۳) حدیث میں ایسا واقعہ بیان نہ کیا گیا ہو جو لوگوں کے ایک جم غفیر کے سامنے پیش آیا ہو، اور پھر بھی اسے بیان کرنے والا منفرد ہو، (۱۴) راوی کی کسی ذاتی غرض اور خواہش پر مبنی نہ ہو، (۱۵) کسی چھوٹی سی بات پر اجر عظیم اور معمولی گناہ پر عذاب شدید کا ذکر نہ ہو۔

ان اصولوں کو دیکھتے ہوئے احمد امین کی اس بات پر غور کیجئے کہ محدثین نے نقد متن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی، کیا کسی بھی درجے میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے؟ افسوس کہ احمد امین بھی مستشرقین کی بولی بول رہے ہیں، یہ اصول خود بتا رہے ہیں کہ محدثین نے نقد متن کے لئے کیسے سخت اصول بنائے تھے پھر ہمارے علماء نے ان مضبوط اصولوں کے ساتھ ساتھ اور بہت سے امور پر توجہ دی، مثلاً روایت کی سند یا متن میں اضطراب نہ ہو، وہ شاذ نہ ہو، اس میں کوئی علت نہ پائی جاتی ہو، وغیرہ۔ اسی طرح یہ بھی دیکھا کہ کہیں اس میں کوئی لفظ غلطی سے شامل تو نہیں کر دیا گیا، کوئی لفظ مدرج تو نہیں ہے۔

ان تمام احتیاطی پہلوؤں کے باجود ہمارے علماء بھی کہتے ہیں کہ اخبار آحاد ظنی ہوتے ہیں، یعنی اگر چہ ان میں غلطی کا امکان ہوتا ہے، مگر غالب گمان یہی ہے کہ وہ صحیح ہیں، اس لیے ان پر عمل کرنا واجب ہے۔

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۲۵)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

جذبۂ دعوت اور صراحت

۱۹۶۱ء میں ندوۃ العلماء کی نظامت کی ذمہ داری مولانا پر آپڑی، مالی حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی تھی، کویت اسی غرض سے سفر کیا گیا جس کے کچھ اسباب ازخود پیدا ہوئے ان تفصیلات سے قطع نظر مولانا نے داعیوں سے کہا کہ میں کسی کے پاس نہ آؤں جاؤں گا اور نہ کچھ کہوں گا، سب آپ لوگوں کو کہنا ہوگا، ان شریف النفس لوگوں نے ساری شرطیں قبول کیں، وہاں ایک مجمع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے ایسی مضبوط، صریح اور معاشرے کی حالت پر منطبق ہونے والی ایسی چبھتی ہوئی بات کہی کہ بعض لوگوں کی چیخیں نکل گئیں اور خود مولانا کے بقول ایک صاحب بے ہوش ہو گئے، آپ نے فرمایا:

''اگر کفار قریش موجودہ مسلمانوں کی حالت کو دیکھ لیں، تو سخت احتجاج کریں کہ ہمیں اس کا ہرگز اندازہ نہ تھا کہ مسلمان طالبِ دنیا وریاست بن جائیں گے، ہم سے جنگ تو صرف ایک مخصوص دعوت، عقیدۂ توحید اور ایک نئی سیرت اور طرزِ زندگی کی بنیاد پر تھی، اگر مسلمانوں کو یہی کرنا تھا تو ہم نے پہلے ہی اس کی پیش کش کردی تھی، مگر اس کو ٹھکرادیا گیا'' (کاروان زندگی ج ا ص ۴۷۰)

مولانا نے پوری جرأت اور مومنانہ شان نیز داعیانہ نظر سے ہر خطرے کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ ذمہ داروں کو اس سے آگاہ کیا، آج جو لوگ حقائق سے واقف نہیں وہ جو چاہیں کہیں لیکن مولانا نے ہمیشہ جزیرۃ العرب کو اسی حالت میں دیکھنے کی خواہش کی اور اس کے لیے کوشش کی جس حالت میں اسے حضورؐ نے چھوڑا تھا اور جس حالت میں اس کو باقی رکھنے کی تاکید کی تھی، اس سفر میں امیر کویت عبداللہ السالم الصباح کو ایک خط لکھا اور بعض خطرات کی بنا پر لا یترك بجزيرة العرب دينان کی حدیث یاد دلائی کاش اسی وقت اس پر عمل ہوتا، مولانا لکھتے ہیں:

''کویت کے اسی سفر میں ایک دن کویت ریڈیو پر إسمعي يا زهرة الصحراء کے عنوان سے میری ایک تقریر ہوئی جس میں کویت کے اس فجائی ظہور وترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ جیسے کسی ریگستان میں اچانک ایک پھول نمودار ہوجائے، بتایا کہ کویت اب دنیا کے موجودہ تمدن اور موجودہ نقشہ میں کیا رول ادا کر سکتا ہے وہ دنیا کو کیا دے سکتا ہے، اس کو اپنی کس شخصیت اور اپنے کس نمایاں کیرکٹر کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کرنا چاہیے؟ اور وہ کس طرح جدید دنیا کا احترام اور عزت کا مقام حاصل کرسکتا ہے؟ کویت کے اسی سفر میں امیر کویت شیخ عبداللہ السالم الصباح کو ایک خط پیش کیا گیا، جس میں عربوں کی ترقی، وحدت وقیادت اور ان کے مشکلات کے حل کا راستہ بتایا گیا، اور آخر میں اس ملک میں غیر مسلم عبادت گاہوں کی تعمیر کے خطرہ سے آگاہ کیا گیا۔ جو کویت اور خلیج کی ریاستوں میں بننا شروع ہوگئی تھیں اور جو لا يترك بجزيرة العرب دينان (جزیرۃ العرب میں دو مذہبوں کو بیک وقت رہنے

کی اجازت نہیں دی جاسکتی) کی وصیت نبوی اور تعلیم کے صریح منافی ہے'' (کاروان زندگی ج ا ص ۴۷۰)

غیر مسلم ملک سے امداد کا مسئلہ

۱۹۹۰ میں رابطہ عالم اسلامی کی مؤتمر میں جو اصل مسئلہ زیر بحث تھا اور جس کا سبب اس وقت کے خلیج کے حالات تھے کہ غیر مسلم ملک سے بدل موجود نہ ہونے کی صورت میں مدد لی جائے یا نہیں، مولانا نے لکھا ہے کہ:۔

''مؤتمر نے تقریباً اس سے اتفاق کیا کہ اضطراری حالت میں اور جب اس کا کوئی بدل موجود نہ ہو اور ملک کے لئے حملہ آور طاقت کی طرف سے سخت خطرہ اور ناقابل تلافی نقصان کا اندیشہ ہو تو یہ وقتی اور عارضی طور پر جائز ہے۔'' (کاروان زندگی ج ۴ ص ۲۹۹)

لیکن صد افسوس ہے کہ اس وقت حکومت سعودیہ کی جو بھی مجبوری تھی اور علماء نے جس طرح بھی اجازت دی! لیکن امریکہ جس نے خلیج کو باور کرایا تھا کہ صدام حسین ان سب کے لئے خطرہ ہے اور پس پردہ اس کا مقصد حجاز کو اپنا فوجی اڈہ بنانا تھا اس میں وہ سو فیصد کامیاب ہوگیا، مگر بہر حال علماء نے اس امید کے ساتھ اس وقت اجازت دی جس کو بطور امانت مولانا نے تاریخ میں رقم بھی کیا کہ حکومت سعودیہ کا وعدہ بھی یہی تھا اور مولانا کی امید بھی، لیکن ہوا کچھ اور، ان کے جس عیش وترف پر مولانا نے تنقیدیں کی ہیں وہ غالب آکر رہیں، آگے بھی وہ اپنی حفاظت کا سامان تیار کرنے سے قاصر رہے اور بالآخر حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب کی گود میں امریکی فوج کی ایک چوکی قائم ہوگئی جو آج بھی قائم ہے، آج کا مبصر یہ کہہ سکتا ہے کہ غالباً اس اقدام سے جزیرۃ العرب کی حفاظت کم خاندانی حکومت کا تحفظ زیادہ مقصد تھا جو پس پردہ رہا اور آج کے حالات اور حکومت سعودیہ کے اقدامات اس پر دلالت بھی کرتے ہیں اس وقت بعض حضرات نے اس موقف سے کھل کر اختلاف کیا اور صاف کہا کہ صدام عالم عربی کے لئے خطرہ ضرور ہے لیکن اس کے لئے امریکی امداد لینا اس سے بڑا خطرہ ہے، خود اسلامی ممالک کو اپنی طاقت جمع کر کے اس کا مقابلہ کرنا چاہیے، لیکن پس پردہ جو تھا وہی غالب آیا، اگر آج خود حضرت والا حیات ہوتے تو کس قدر رنج ہوتا، بتانے والے بتاتے ہیں کہ سعودی حکومت کے اس فریب اور عہد شکنی اور وہاں امریکی فوج کی موجودگی کے باعث مولانا آخر عمر میں فرماتے تھے کہ اگر حرمین کا اشتیاق نہ ہوتا تو حجاز کا سفر نہ کرتا،(۱) مولانا کی امید اور حکومت سعودیہ کا پر فریب وعدہ ملاحظہ کیجئے:۔

''البتہ اس پر سب کا اتفاق اور حکومت سعودیہ کا کھلا ہوا وعدہ اور اعلان تھا کہ یہ خطرہ ٹل جانے کے بعد امریکی و برطانوی فوجیں ایک دن بھی زائد نہیں رہیں گی خود امریکہ کا بھی یہی بار بار اعلان ہے۔(والغیب عند اللہ)'' (کاروان زندگی۔ ج ۴، ص ۳۰۰)

دین کے داعی کے کام اور اوصاف:

ایک داعی کو کیوں لوگوں کو مخاطب کرنا چاہئے اور کس طرح کرنا چاہئے، اس کی کیا ذمہ داریاں ہوتی ہیں، ملک فہد کو اپنے لکھے گئے ایک خط کا تذکرہ کرنے سے پہلے تحریر فرماتے ہیں!

''دین کے ایک داعی اور ایک ایسے بے غرض، صاحب فکر و درد مند انسان کا (جس کے پیش نظر صرف اظہار حق، فلاح مسلمین اور اسلام کی تعلیمات اور کتاب وسنت کی رہنمائی کی روشنی میں اصلاحِ حال کا جذبہ اور ''کونو قوامین لِلّٰہ شھداء بالقسط'' کے فرمانِ خداوندی پر عمل کرنے کے سوا کوئی مقصد نہ ہو) ایسے طرز عمل کی گنجائش نہیں جس میں صرف کوئی ایک شخصیت یا کوئی ایک معاشرہ اور ملک ہی مرکز توجہ اور موضوع تنقید واحتساب ہو، اور دعوت صرف

(۱) اس بات کا تعلق صرف مولانا کے بعض اہل تعلق سے سنی گئی روایت پر ہے کہیں تحریر راقم کی نظر سے نہیں گذری واللہ اعلم بالصواب

یک رخی ''اتجـاہٌ واحدٌ'' اور (One Way Traffic) کا مصداق نہ بن جائے۔ (کاروان زندگی ج۵ص۲۰)

مولاناؒ کی جرأت و بے لوثی:

۱۹۹۹ء میں جب حضرت مولاناؒ کو دبئی میں عالمی علمی و اسلامی شخصیت کا ایوارڈ دیا گیا تو اول تو اس کو لینے جانے سے حتی الامکان معذرت کی، پھر جب گئے تو اس ایوارڈ کو لیتے ہی اس کو مختلف دینی اداروں میں تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا، پھر اس موقع پر شکر و امتنان کے کلمات کے بعد اپنے قدیم مضمون کا جو حصہ پڑھا اس کا اقتباس سبق آموز اور ترجمان حقیقت ہے:۔

''کہ عربوں کو جو دولت و نعمت، سعادت و توفیق، اور منصب ہدایت و رہنمائی ملا، وہ سب نبی عربی امّی مکی مدنی خاتم النبیین وسید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں تھا، اور آپ کے ذریعہ ہی ملا، اگر اس حقیقت سے قطع نظر کر لیا جائے اور اتباع و اقتداء کا یہ رشتہ نہ رہے تو عرب قوم فن عروض کی اصطلاح ''بحر'' کی طرح ہو جائے گی کہ اس کو بحر کہتے ہیں لیکن اس میں پانی کا ایک قطرہ تک نہیں ہوتا، اور وہی اس سلسلہ میں شکر و اعتراف اور تمسک و اتباع کے مستحق ہیں''۔ اس مضمون کے پڑھنے کے بعد راقم نے جب دیکھا کہ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی بھی بڑی تعداد موجود ہے تو اس نے اس پورے مضمون کا حاصل علامہ اقبالؒ کے شعر کی شکل میں سنایا اور اس کو بار بار پڑھا جس میں پوری وضاحت اور قوت ایمانی کے ساتھ یہ حقیقت بیان کی گئی ہے، وہ کہتے ہیں ۔

نہیں وجود حدود و ثغور سے اس کا
محمد عربی سے ہے عالم عربی

(کاروان زندگی ج۷۔ص۲۲۲)

اس موقع پر حضرت مولاناؒ نے مسجد عزیز میں تقریر کرتے ہوئے اس حدیث کا بھی تذکرہ کیا (أخرجوا اليهود والنصارى من جزيرة العرب) جس کا وہ بار بار اپنی مجلسوں، ملاقاتوں اور خطوط و خطابات میں تذکرہ کرتے رہے اور عربوں کو اس کے مضمرات و خطرات سے متنبہ کرتے رہے۔

مولانا کا داعیانہ کردار اور ملی تڑپ

مارچ ۱۹۹۹ میں جب حضرت مولاناؒ پر فالج کا اثر تھا، سخت علالت و ضعف کے ساتھ صاحب فراش تھے، ایسی حالت میں بھی جب وزیر اعظم اٹل بہاری وزیر اعظم ہند اپنی ٹیم کے ساتھ ملاقات و عیادت کے لئے آئے تو، باوجود مرض و ضعف کے مولانا نے اپنا فریضہ ادا کیا:

''خاکسار نے ان کی اس آمد اور براہ راست ملاقات سے فائدہ اٹھا کر ایک محبّ وطن اور خیر خواہ ملک کی حیثیت سے اپنا فرض انجام دیا، اور کہا کہ اس عظیم و عزیز ملک کا بقا و استحکام کے لئے وہ تین شرطیں ضروری ہیں، جو اس ملک کے دور اندیش اور صاحب نظر رہنماؤں نے بالخصوص گاندھی جی نے ضروری قرار دے دی تھیں، ایک یہ کہ یہ جمہوری ملک (DEMOCRATIC) ہو، دوسرے کسی خاص مذہب کا حامی اور داعی نہ ہو، بلکہ سیکولر (SECULER) ہو، تیسرے یہ کہ غیر متشدد اور صلح پسند (NON.VIOLENT) ہو، جب کبھی اس کے خلاف کیا جائے گا تو یہ ملک خطرہ میں پڑ جائے گا اور یہاں زندگی دشوار ہو جائیگی، اس لئے ان حقیقتوں کا لحاظ اور ان خطرات کا احساس اور خوف رہنا چاہئے۔'' (کاروان زندگی ج۷ص۲۴۴)

☆☆☆

(.....جاری)

❑ فقہی مباحث (قسط-۱)

بین مذہبی مذاکرات-اصول وآداب

محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

تمہید:: یہ حقیقت ہے کہ آج پوری دنیا ایک چھوٹے سے گاؤں میں سمٹ گئی ہے۔ دنیا کی مسافت اور فاصلہ کم ہوگیا ہے، اور دوری نزدیکی میں بدل گئی ہے، ایک زمانہ تھا جب سو پچاس کلومیٹر مسافت طے کرنے میں کئی کئی گھنٹے صرف ہوجاتے تھے اور آج جدید ٹکنالوجی نے اس کو اتنا آسان کردیا کہ مہینوں کی مسافت چند گھنٹے میں طے ہوجاتی ہے۔ جدید سائنسی ترقیات نے پوری دنیا کی خبروں کو منٹوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک پہونچانے کی سہولت پیدا کردی ہے، ان سب کے پیچھے اس ذاتِ باری تعالیٰ کا ہاتھ اور فضل ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ ذات بدیع السمٰوٰت والارض ہے، فعال لما یرید ہے اس نے انسان کو زمانے کے تقاضے اور حالات کے مطابق عقل وحکمت اور شعور ووجدان کی دولت سے نوازا ہے، اور وعلّم آدم الأسماء کلها کہہ کر سائنس وٹکنالوجی کے دروازے کو انسانوں کے لئے وا کردیا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ لوگوں کی واقفیت دنیا اور اس کی آبادی کے بارے میں محدود تھی، زیادہ سے زیادہ انسان اپنے اطراف واکناف، ملک اور پڑوسی ملک کے بارے میں واقفیت رکھتا تھا، مشترکہ آبادی کا تصور بہت کم تھا، لیکن موجودہ دور میں مختلف سماجی اور سیاسی عوامل کے نتیجے میں مشترک سماج اور معاشرے وجود میں آرہے ہیں، دنیا کے اکثر ملکوں میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والی ملی جلی آبادیاں پائی جاتی ہیں بلکہ ایک سروے کے مطابق دنیا کی نصف آبادی مسلم غیر مسلم اکثریت ممالک میں آباد اور رہائش پذیر ہیں۔ اور خود ملک ہندوستان میں انڈونیشیا کو چھوڑ کر مسلمانوں کی سب سے بڑی تعداد آباد ہے۔

امت محمدیہ کی دعوت عالمی دعوت ہے: چونکہ مذہب اسلام نے مسلمانوں کو اس کا مکلّف بنایا ہے کہ وہ دعوتِ توحید کو دنیا کے کونے کونے تک پہونچائیں اور رسالت اور ختم رسالت کے مقام اور اس کے مفہوم سے سارے انسانوں کو روشناس کرائیں کیوں کہ سارے انسان ایک ہی مرد (آدمؑ) سے اس دنیائے آب وگل میں وجود پذیر ہوئے ہیں، اور آخری نبیؐ عالمی نبی اور رسول ہیں ان کی دعوت عالمی اور انٹرنیشنل ہے اس لئے دنیا کے بسنے والے تمام لوگوں تک یہ صدائے حق پہنچے اور اس سلسلے میں مذہبی مذاکرات کی ضرورت پڑے تو اس میں بھی ایمان والوں کو پیش پیش رہنا چاہیے "یا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا و بينكم أن لا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا" اس کا صرف جواز ہی نہیں فراہم کرتا بلکہ اس کا حکم دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پوری دنیا میں عام ہو اور جامِ توحید سے نوعِ بشری سرشار ہو۔

عصرِ حاضر میں مذہبی مذاکرات کی ضرورت: عصرِ حاضر میں آبادیوں کے اختلاط اور تعلقات کی وسعت اور ہمہ گیری کی وجہ سے بین الاقوامی مذہبی مذاکرات کی ضرورت بڑھ گئی ہے، ان مذاکرات کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ اس طرح دوسروں کو سمجھنے اور خود اپنے آپ کو سمجھانے، غلط فہمیوں کو

دور کرنے، امن وامان قائم رکھنے، باہمی اختلافات کو دور کرنے، شدت پسندی کو روکنے اور بقائے باہم کے اصول پر رواداری اور ایک دوسرے کے ساتھ احترام کے ساتھ رہنے میں مدد ملتی ہے۔ دنیا کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانے کے نبی اور رسول نے اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ حوار یعنی مذہبی مذاکرہ کیا اور حکمت و دانائی کے ساتھ اپنی دعوت کو ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی۔ جس کی مختصر تفصیلات آگے پیش کی جارہی ہے۔

بین مذہبی مذاکرات کتاب وسنت کی روشنی میں: قرآن مجید اور دیگر الہامی کتابوں میں انبیاء کے واقعات، اور ان نبیوں اور رسولوں کے اپنی اپنی قوموں سے تخاطب و خطاب اور تبادلہ خیال پر اگر غور کیا جائے تو وہ مذہبی مذاکرات کے بہترین نمونے ہیں، مذہبی مذاکرات کو مذہبی مناظرہ کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے وقت کے بادشاہ نمرود (جو اپنے کو خدا سمجھتا تھا) سے زبردست مناظرہ کیا، چنانچہ اس مناظرہ اور مذاکرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

"الم ترإلى الذى حاج ابراهيم فى ربه أن آتاه الله الملك إذ قال ابراهيم ربى اللذى يحيى ويميت قال انا أحى وأميت قال ابراهيم فإن الله يأتى بالشمس من المشرق فأت بها من المغرب فبهت اللذى كفر" (البقرۃ: ۲۵۸) (ترجمہ: کیا تو نے اسے نہیں دیکھا جو سلطنت پاکر ابراہیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑ رہا تھا، جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے، وہ کہنے لگا میں بھی جلاتا اور مارتا ہوں، ابراہیمؑ نے کہا اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی طرف سے لے آتا ہے تو اسے مغرب کی جانب سے لے آ۔ اب تو وہ کافر بھونچکا رہ گیا)۔

اور حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے مذاکرے اور مناظرہ کا نقشہ قرآن کچھ اس انداز میں بیان کرتا ہے:

قال فرعون وما رب العالمين قال رب السموات والأرض وما بينهما إن كنتم موقنين قال لمن حوله ألا تستمعون قال ربكم ورب آبائكم الأولين قال إن رسولكم اللذى أرسل إليكم لمجنون قال رب المشرق والمغرب وما بينهما إن كنتم تعقلون قال لئن اتخذت إليها غيرى لأجعلنك من المسجونين قال اولو جئتك بشيء مبين قال فأت به ان كنت من الصادقين فألقى عصاه فإذا هى ثعبان مبين ونزع يده فإذا هى بيضاء للناظرين الشعراء:۲۳-۳۳) (ترجمہ: فرعون نے کہا رب العالمین کیا ہے؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا وہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے، اگر تم یقین رکھنے والے ہو، فرعون نے اپنے اردگرد لوگوں سے کہا کہ کیا تم سن نہیں رہے ہو؟ حضرت موسیٰ نے فرمایا وہ تمہارا اور تمہارے اگلے باپ داداؤں کا پروردگار ہے، فرعون نے کہا (لوگو!) تمہارا یہ رسول جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے یہ تو یقیناً دیوانہ ہے، حضرت موسیٰؑ نے فرمایا: وہی مشرق اور مغرب کا اور ان کے درمیان کی تمام چیزوں کا رب ہے، اگر تم عقل رکھتے ہو، فرعون کہنے لگا سن لے! اگر تو نے میرے سوا کسی اور کو معبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں ڈال دوں گا، موسیٰ نے کہا اگر چہ میں تیرے پاس کوئی کھلی چیز لے آؤں؟ فرعون نے کہا اگر تو سچوں میں سے ہے تو اسے پیش کر، آپؑ نے (اسی وقت) اپنی لاٹھی ڈال دی جو اچانک کھلم کھلا (زبردست) اژدہا بن گئی، اور اپنا ہاتھ کھینچ نکالا تو وہ بھی اسی وقت ہر دیکھنے والے کو سفید چمکیلا نظر آنے لگا)۔

جہاں تک مذہبی مذاکرہ کا ثبوت احادیث سے ہے تو اس سلسلے میں متعدد احادیث ہیں جن سے مذہبی مذاکرہ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اس سلسلے میں صرف ایک حدیث پیش کی جارہی ہے جس کے راوی محمد بن اسحٰقؒ ہیں۔

قریش کے سرداروں میں سے ایک عتبہ بن ربیعہ ایک روز قریش کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ اور آنحضرت ﷺ بھی تن تنہا حرم میں تشریف

فرماتے۔عتبہ نے کہا اے گروہِ قریش! میں اٹھ کر محمدؐ سے گفتگو کیوں نہ کروں، اوران کے سامنے بعض ایسی باتیں کیوں نہ پیش کروں جن میں سے کچھ نہ کچھ وہ قبول کرلے اور وہ ان میں سے جو رعایتیں چاہے ہم اسے دے دیں اور وہ ہم سے باز رہے، تو قریش کے لوگوں نے کہا کیوں نہیں؟ اے ابولید! اٹھ اور رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کر۔عتبہ اٹھا اور آپؐ کی طرف چلا اور آپ کے قریب جا کر بیٹھ گیا اور کہا!

بھتیجے! تمہیں معلوم ہے کہ تم ہماری نظروں میں باعتبار خاندان بڑے رتبے والے ہو اور نسب کے لحاظ سے بھی اعلیٰ ہو، تم اپنی قوم کے پاس بڑی اہمیت رکھنے والا مسئلہ لائے ہو، جس کے ذریعہ سے اس جماعت کو تم نے تتر بتر کر دیا ہے، ان کے عقلمندوں کو بیوقوف بنا دیا ہے، ان کے معبدوں اور دین کو عیب دار بنا دیا ہے اور ان کے اگلے بزرگوں کو کافر قرار دیا ہے۔ میری گفتگو سنو! میں چند باتیں تمہارے غور کے لئے پیش کرتا ہوں، شاید تم ان میں سے کچھ قبول کر لو۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: قل یا ابا الولید أسمع ، اے ابوالولید! کہو میں سنتا ہوں، اس نے کہا اگر تم اس مسئلہ کے ذریعہ سے جسے تم لائے ہو، صرف مال چاہتے ہو، تو ہم تمہارے لئے اس قدر مال جمع کر دیں گے کہ تم ہم سب میں سب سے زیادہ مالدار ہو جاؤ گے۔اگر تم اس کے ذریعہ اعلیٰ مرتبہ چاہتے ہو تو ہم تمہیں اپنا سردار بنالیں گے کہ کوئی بات تمہارے بغیر قطعی نہ ہو، اگر تم اس کے ذریعے حکومت چاہتے ہو، تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں۔ یہ جو تمہارے پاس آتا ہے اگر کوئی جن اور موکل ہے جسے تم دیکھتے ہو اور اپنے پاس سے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے تو ہم تمہارے لئے جھاڑ پھونک کا انتظام کریں گے۔اور ہم مال خرچ کر کے اس سے تمہیں نجات دلائیں گے۔ کیوں کہ بعض اوقات تابع (موکل اور جن) آدمی پر غلبہ حاصل کر لیتا ہے تو وہ علاج معالجہ کے بغیر نہیں جاتا۔یہی الفاظ یا اس قسم کے الفاظ اس نے آپؐ سے کہے۔

آپؐ اس کی گفتگو سنتے رہے اور جب عتبہ اپنی گفتگو ختم کر چکا تو آپؐ نے فرمایا: اے ابوالولید! تجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا؟ کہا ہاں، فرمایا اب مجھ سے سن۔بولا سنائیے رسول اللہ ﷺ نے قرآن مجید کا یہ ٹکڑا پڑھا: بسم اللہ الرحمن الرحیم، حم، تنزیل من الرحمن الرحیم، کتاب فصلت آیاته، قرآنا عربیا لقوم یعقلون بشیرا ونذیرا فأعرض اکثرهم فهم لا یسمعون وقالوا قلوبنا فی اکنة مما تدعوننا الیه (سورۃ فصلت:۱-۵)

پھر رسول اللہ اسی سورت کو اس سے آگے پڑھتے چلے گئے، عتبہ خاموش سنتا رہا، ہاتھ پیچھے رکھ لئے اور ان سے سہارا لئے ہوئے تھا، اس کے بعد رسول اللہ سجدہ تک پہنچے تو سجدہ کیا پھر فرمایا۔ "قد سمعت یا ابا الولید ما سمعت فأنت ذاك"

پھر عتبہ واپس قریش کے پاس لوٹا تو قریش نے خیریت پوچھی، عتبہ نے جواب دیا۔خدا کی قسم جانے کی کیفیت کچھ تھی اور آنے کی کیفیت اس کے برعکس ہے۔ایسی گفتگو میں نے زندگی میں کبھی نہیں سنی وہ نہ شعر ہے نہ جادو اور کہانت۔قریش نے جب یہ سنا تو ان پر سناٹا طاری ہو گیا اور کہا واللہ اس نے تم پر اپنی زبان کا جادو کر دیا، (ملخص سیرت ابن ہشام:۱۶-۳۱۷)

اس کے علاوہ اور بھی بہت سے وفود آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مذاکرہ کیا اور پھر حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مذہبی مذاکرہ کا مقصد کیا ہو؟

(۱) مذہبی مذاکرہ کا مقصد اور اولین مقصد غیر مسلموں پر دعوتِ ایمان پیش کرنا ہو اس لئے کہ اس دنیا میں جتنے انبیاء اور رسول تشریف لائے اور انہوں نے اپنی قوم کے ساتھ جو مذاکرہ کیا ان سب کی بنیاد دعوتِ ایمان پر ہے، اس لئے اسلامی نقطۂ نظر سے مذاکرہ بین المذاہب کا بنیادی مقصد توحید، عقیدۂ آخرت اور دعوت الی اللہ ہونا چاہیے۔قرآنِ مجید نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون بالله۔ ''ناس'' کا لفظ قرآن مجید میں زیادہ تر مشرکین کے لئے استعمال ہوا ہے۔''معروف'' کا

سب سے اعلیٰ درجہ ایمان ہے۔ ''منکر'' میں سب سے سخت درجہ کا کفر و شرک ہے۔ گویا اس آیت میں مسلمانوں کو اصلاً غیر مسلموں پر دعوت ایمان پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور اہل کتاب کو ایمان کی طرف بلانے کا کچھ زیادہ اہتمام اس آیت میں ظاہر ہو رہا ہے۔

(۲) مذہبی مذاکرات کا دوسرا اہم مقصد مشرکین و کفار اور اہل کتاب کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہونا چاہیے کیوں کہ اگر دل میں شکوک وشبہات کے انبار ہوں اور شکوک کے کانٹے چبھ رہے ہوں اور دلوں میں غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ہوں تو پھر ایسے لوگوں کو ایمان کی توفیق کیسے مل سکتی ہے؟.....

قرآن مجید اور انبیاء کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بہت سے مواقع پر انبیاء کرام اور رسولانِ عظام کی اپنی اپنی قوموں سے جو گفتگو ہوئی اس خاص موقع پر اس گفتگو کا مقصد اپنی قوم اور مخاطب کی غلط فہمی اور شکوک وشبہات کو دور کرنا تھا۔ ذرا ان الزامات پر غور کیجئے جو انبیاء کرام پر ان کی قوموں نے لگائے کسی نے مجنوں کہا، کسی نے آسمانی وحی کو اساطیر الاولین کہا، کسی نے اور کچھ کہا لیکن انبیاء کرام نے پورے تحمل اور بردباری کے ساتھ ان کا جواب دیا اور ان کی غلطی کو دلائل اور شواہد سے واضح کیا۔

اہل مکہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹی قرار دیتے تھے قرآن مجید نے اس کی بھرپور تردید کی اور اہل مکہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ألكم الذكر وله الانثى تلك إذا قسمة ضيزى" کہ یہ کیسی بات ہے کہ اپنے لئے بیٹے پسند کرتے ہو اور خدا کے لئے بیٹیاں ثابت کرتے ہو۔

یہودیوں کا یہ خیال تھا کہ حضرت ابراہیم یہودی تھے اور حضرت ابراہیم کے بارے میں عیسائی کہتے تھے کہ وہ عیسائی ہیں قرآن نے بالکل صاف واضح کر دیا، ما كان ابراهيم يهوديا ولا نصرانيا ولكن كان حنيفا مسلما حضرت ابراہیمؑ نہ یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ وہ دین حنیف پر قائم تھے۔

کیوں کہ یہودیت اور عیسائیت کا آغاز ہی حضرت ابراہیمؑ کی کئی نسلوں کے بعد ہوا۔ غرض یہ کہ مذاکرات کا دوسرا مقصد غلط فہمیوں کا ازالہ ہے اور سچائی یہ ہے کہ شکوک وشبہات اور غلط فہمیوں کے ازالے کا یہ بہت موثر اور کارآمد ذریعہ ہے۔

(۳) مذہبی مذاکرہ کا تیسرا مقصد باہمی دشمنی، نفرت اور عداوت کے جذبات کو ختم کرنا اور کرانا ہونا چاہیے، بہتر اور مفید گفتگو بھی رائیگاں نہیں جاتی اگر سامنے والا آپ کی بات کو پوری طرح تسلیم نہ کرے اور اس کی ضد اور ہٹ دھرمی ختم نہ ہو لیکن کم ضرور ہو جائے گی۔

قرآن مجید نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

ولا تستوى الحسنة ولا السيئة إدفع بالتى هى أحسن فإذا الذى بينك وبينه عداوة كانه ولى حميم. (فصلت:۳۴)

نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی برائی کو بھلائی سے دفع کرو پھر وہی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے ایسا ہو جائے گا جیسے دلی دوست۔

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جہاں دعوتِ دین کا یہ فائدہ ہے کہ مخاطب کو ہدایت نصیب ہوتی ہے وہیں یہ فائدہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالفت کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں یا سرد پڑ جاتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کے ارشارے پر جب صحابہ کرامؓ نے حبشہ کی طرف ہجرت کی اور اسلام دشمنی میں قریش کے لوگوں نے وہاں بھی اپنا نمائندہ ان مہاجرین حبشہ کو واپس لانے کے لئے بھیجا اس موقع پر حضرت جعفر طیارؓ نے جو مذاکرہ نجاشی کے ساتھ کیا وہ نجاشی کے اطمنان کا، مسلمانوں کے ساتھ بہتر سلوک کا اور بالآخر نجاشی کے ایمان لانے کا سبب بنا۔

ہجرت کے بعد میثاق مدینہ کو بھی بین مذہبی مذاکرات کی تائید اور جواز میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں مدینہ کے اندر مسلمانوں کو پرسکون زندگی گزارنے کا موقع ملا، اور غزوۂ اُحزاب تک معاندین اسلام کو کھل کر مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کی ہمت نہیں ہوئی البتہ خفیہ طور پر وہ سازشیں کرتے رہے۔ (ملخص کلیدی خطبہ بموقع سیمینار الضوابط الشرعیہ والمنہجیہ للحوار بین الأدیان، ۲۲-۲۴/اپریل ۲۰۱۳ء مقام دہلی یونیورسٹی)

☆☆☆ (.....جاری)

□ فقہی مباحث

مصنوعی طریقۂ تولید اور ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا حکم

محبوب فروغ احمد قاسمی
خادم حدیث وفقہ، کیرالا

حصولِ اولاد کا جذبہ انسان کا فطری تقاضا ہے، نکاح کے اہم مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد اولاد کا حصول بھی ہے، حدیثوں میں ودود وولود سے نکاح کی ترغیب آئی ہے۔ بلا ضرورت عزل کو بھی تحسین کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا کیوں کہ ظاہری طور پر اس سے حصول اولاد میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے، اولاد کی تمنا محمود وپسندیدہ ہے حتی کہ انبیاء تک کو ہوتی ہے، اولاد کی طلب انسان کی فطرت میں ودیعت ہے، اس جذبہ کو دبایا نہیں جاسکتا۔ چوں کہ نکاح کے مقاصد میں سے یہ ایک مقصد ہے اس لیے شرعی مصلحت بھی اس سے متعلق ہوجاتی ہے، اس سے انسان کی نسل قائم رہتی ہے۔ نسل واولاد کی تحصیل کا فطری طریقہ جماع ہے خواہ وہ حلال طریقے سے ہو یا حرام طریقے سے، دورِ جاہلیت میں زنا سے بھی تحصیل نسل میں کوئی عار نہیں سمجھا جاتا تھا، ایک ایک بچہ کے لئے کئی دعویدار ہوتے، ہر ایک کے اپنے فرضی قرینے ہوتے جن کو پیش کیا کرتے، مگر اسلام نے ایسے تمام طریقوں پر پابندی لگادی جن میں اشتباہ کا خطرہ بھی ہو، کیوں کہ تحفظ نسل ونسب اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، وراثت، نفقہ، حرمت مصاہرت، ولادت، وصیت جیسے اہم ابواب شرع نسب پر موقوف ہوتے ہیں، اختلاط واشتباہ سے ان سارے ابواب پر زد پڑتی ہے؛ زنا کی حرمت، معتدہ سے نکاح کرنے کی ممانعت، باندی پر ملکیت حاصل ہونے کے بعد استبراء کا حکم، ایک عورت کے لیے بیک وقت ایک سے زائد مرد سے نکاح کرنے کی ممانعت ان سب کے پیش نظر نسب ونسل کو اشتباہ واختلاط سے بچانا ہے، حضرت رویفع بن ثابت رضی اللہ عنہ مرفوعاً حدیث بیان کرتے ہیں:

لا يحل لامرإ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يسقي ماء ه زرع غيره، ولا يحل لامرإ يؤمن بالله واليوم الآخر أن يقع على امرأة من السبى حتى ليستبرأها (ابوداؤد:۱/۲۹۳، کتاب النکاح، باب فی وطی السبایا)

(مومن کے لیے حلال نہیں کہ اپنے پانی سے دوسرے کی کاشت سیراب کرے، اور مومن کے لیے حلال نہیں کہ کسی قیدی عورت سے استبراء سے قبل جماع کرے)

یہی وہ امتیازی وصف ہے جو انسانوں کو دیگر جانداروں سے ممتاز کرتا ہے، ورنہ توالد وتناسل کا سلسلہ تو ہر جاندار مخلوق میں موجود ہے، مگر دوسرے حیوانات کا نسب معلوم وممتاز نہیں، یہ انسانوں کی فطری حاجت اور دینی ضرورت ہے کہ نسب کی حفاظت کی جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں نسب کا انکار کرنے سے روکا گیا، اس کے اقرار واعتراف کی ترغیب دی گئی، اس بابت ایک حدیث ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے: حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

''جس عورت نے کسی خاندان میں ایسے شخص کو (دعویٰ نسب کرکے) شامل کیا جو ان میں سے نہیں تھا تو اللہ کی کچھ بھی رحمت اس پر نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی جنت میں داخل نہیں کرے گا، اور جس

مرد نے اپنے بچے کا انکار کیا حالانکہ اس کو معلوم ہے، اللہ تعالیٰ اپنے دیدار سے محروم کرے گا اور اس کو سب لوگوں کے سامنے قیامت کے دن رسوا کرے گا) (نسائی: ۹۴/۲، کتاب اللعان، باب التغلیظ فی الانتفاء، أبوداؤد ص ۳۰۸ کتاب الطلاق، باب التغلیظ الخ)

جب تک اسلام پر مر مٹنے کا جذبہ جوان رہا، حصول اولاد کی ساری کوششیں شریعت کے مقرر کردہ حدود میں رہ کر کی جاتی رہیں اگر ان حدود میں رہتے ہوئے اولاد حاصل ہوگئی تو فبھا ورنہ لا ولد ہونے پر ہی قناعت کر لی گئی، کیوں کہ اللہ کا ایک نظام ''عُقم'' بھی ہے، عنداللہ ایسی عورتوں کا مرتبہ کسی بھی طرح کم تر نہیں، مگر مشینی دور میں ہر چیز کو مشین کے تابع کر دیا گیا، ان ایجادات وانکشافات نے جہاں بہت سی آسانیاں پیدا کیں، وہیں بہت سی قباحتوں کے بوجھ سے بوجھل بھی کر دیا، افکار وخیالات میں عجیب انقلاب برپا ہوا، ہر شخص دنیا کے جاہ وجلال، شرف وکمال کا دل دادہ ہو کر رہ گیا۔ اب ہر شخص کا صاحب اولاد ہونا گویا ضروری ہو گیا خواہ اس کے لیے کتنے جائز وناجائز جتن کرنے پڑ جائیں، اس نظریہ نے انسان وجانور کا فرق مٹا دیا، بعض جاندار بھی انڈوں کو حرارت پہنچا کر بچے پیدا کرتے ہیں، انسانوں نے بھی مشینی بچہ پیدا کرنے کی تدبیر نکال لی، ماہرین کے مطابق اس کے مختلف طریقے ایجاد کیے گیے بعض طریقے تو ایسے بھی ہیں جن میں اخلاقی قدروں کی تمام حدود کو تجاوز کرنا پڑتا ہے، ٹھیک ہے بعض اوقات اولاد نہ ہونے سے معاشرہ میں قدر گھٹ جاتی ہے، ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، زندگی کبھی اجیرن بھی بن جاتی ہے، دو باہم شیر وشکر رشتے میں دراڑ پیدا ہو جاتی ہے اس لحاظ سے اس وقت کی حاجت میں شامل ہے، لیکن کیا اس کے لیے اصول سے بغاوت کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے، بہت سے معاصرین کی رائے میں یہ اس وقت کی حاجت ہے، اس لیے جس طرح علاج ومعالجہ میں بہت سی خلاف شریعت چیزیں گوارہ کر لی جاتی ہیں، یہاں بھی گوارہ کر لیا جائے گا، بشرطیکہ حصولِ اولاد کی خاطر لیے ہوئے مادۂ تولید اور بیضۂ منی اجنبی مرد وعورت کے نہ ہوں، اگر زوجین کے ہیں تو اس کو اس ضرورت کی وجہ سے مباح کہا جاسکتا ہے، مجمع الفقہ الاسلامی مکۃ المکرّمہ کا فیصلہ بھی اس بابت یہی ہے، ہر چند کہ بعض شرکاء بالخصوص صدر اجلاس کو بھی شرح صدر نہیں ہے، ان حضرات کے پیش نظر یہ ہے کہ یہ علاج ومعالجہ ہے، علاج ومعالجہ میں بہت سی ناگوار باتیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں، اس طریقے میں چوں کہ مادۂ تولید کو کارآمد بنانا ہے لہذا استمناء بالکف کی ممانعت کے زمرے میں داخل نہیں ہوگا کیوں کہ وہاں ممانعت کی علت مادۂ تولید کی اپنے فعل سے تضییع ہے۔

لیکن یہ ناچیز اس کو سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ علاج ومعالجہ ہے، اگر علاج ومعالجہ مانا جائے تو پھر زوجین کے مادہ کی قید کی حاجت ہی نہیں پھر تو اجنبی مرد یا زن کا مادہ لے کر بھی تولید کروانی جائز ہوسکتی ہے، علاج سے انسان کو صحت وتندرستی ملتی ہے مگر مادۂ منویہ کو بارآور کر کے پھر رحم میں لوٹا کر مرد وزن کو کون سی تندرسی حاصل ہوئی، یہ تو شیء ثالث کا ایجاد محض ہے جو شرعی اصول سے ہٹ کر کیا گیا ہے۔

نیز استمناء بالکف میں یہ نکتہ آفرینی کرنا کہ ممانعت اس وجہ سے ہے کہ مادہ کو ضائع کرنا ہے بلا کسی فائدہ کے، اسی لیے فقہاء نے تصریح کی ہے:

وعبارة الفتح: فإن غلبته الشهوة ففعل إرادة تسكينها به فالرجاء أن لا يعاقب (درمختار: ۱۰۹/۲ کتاب الصوم، مطلب فی حکم الاستمناء بالکف)

اگر شہوت کا غلبہ ہو تو تسکین شہوت کے لیے استمناء کی تو امید ہے کہ عقاب نہیں ہوگا)

اولاد کے حصول میں بھی تسکین ہوتی ہے اس لیے مادۂ تولید کو بارآور بنانے میں حرج نہیں ہے۔ مگر غور کیا جائے تو اولاد سے ہونے والا سکون قلب، اور اخراج منی سے ہونے والا سکون نفس دونوں میں بہت فرق ہے، ایک میں نفس کو سکون ملتا ہے، دوسرے میں دل کو سرور حاصل ہوتا ہے، جیسے مال ومتاع کے نہ ہونے سے قلب کو بے چینی رہتی ہے، اور مل جانے پر سکون ہوتا ہے تو کیا مال وزر کے فقدان سے ہونے والی بے چینی بھی امراض کے زمرے میں آئے

گی؟ استمناء بالکف والے مسئلہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نفع وصحت جو ذات کو حاصل ہو اس کے لیے اخراج میں حرج نہیں، اس لیے بدون ناگفتہ بہ حالات کے اس کی حوصلہ افزائی اس صورت میں نہیں کرنی چاہیے جس میں صرف زوجین کے مادے کو کسی دوا کے ذریعہ بارآور بنا کر عورت کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہو، اور یقین ہو کہ ڈاکٹر نے کسی اجنبی مرد یا عورت کے مادے کو اس میں خلط ملط نہ کیا ہو، زیادہ مناسب یہ ہے کہ اس کو شرب خمر اور اکل میتہ پر قیاس کیا جائے کیوں کہ دونوں ہی صورتوں میں شیٔ نجس کو اندر پہنچایا جارہا ہے، لہذا جب تک اضطراری کیفیت نہ ہو اس وقت تک حوصلہ افزائی نامناسب معلوم ہوتی ہے۔ اس کو ''خون'' چڑھانے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ خون چڑھانے میں مریض کو صحت وتندرستی حاصل ہوتی ہے، اور وہ انسان کا جزء بن جاتا ہے، اگر مادۂ تولید کی زراعت کی اجازت عام کردی جائے تو زن وشوہر کے تعلقات کا بیڑا غرق ہوجائے گا، خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا، اور مسلم سماج بھی یورپ کی طرح خاندانی ونسبی پستی وانتشار کا شکار ہوجائے گا، نیز وہ عظمتیں جو نسب ونسل کی حفاظت کی رہینِ منت ہیں سب پارہ پارہ ہوجائیں گی، محبت والفت کا خون ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ انسان آدمی کے لباس میں جانور بن کر زندگی گزارنے کو ترجیح دے گا، منعفت سے زیادہ مضرت کے حقیقی خدشے زیادہ ہیں، تجربہ ومشاہدہ نیز باخبر وبامروت ماہرین کی تحریریں اس پر شاہد ہیں۔

بہرحال ٹیسٹ ٹیوب کی ایک نوعیت تو یہ ہے جس سے فی الوقت بحث نہیں۔ گفتگو کا محور تو اس کے اردگرد ہے کہ مادۂ تولید کو جائز یا ناجائز طریقے سے بارآور کرکے بچہ حاصل کرلیا گیا تو اب نومولود کا نسب ثابت ہوگا یا نہیں؟

ثبوت نسب کی بابت اصول و ضوابط:

اسلام میں انسانی جان کی بڑی وقعت ہے، بالخصوص معذور وکمزور افراد کے حقوق کی رعایت زیادہ کی گئی ہے، حتی الامکان ضائع ہونے سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، اگر بچہ ثابت النسب نہیں ہوتا، تو نہ اس کا خاندان ہوتا ہے نہ اپنے پرائے، انسانی معاشرے میں الگ تھلگ ہوکر بہت سی خوبیوں اور حقوق تک سے محروم ہوجاتا ہے، اس لیے شریعت اسلام نے ثبوتِ نسب میں احتیاط کا پہلو اختیار کیا ہے اور جہاں تک ممکن ہو نسب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، نیز اس کے لیے بنیادی اصول یہ طے کیا کہ ''فراش'' سے نومولود کا تولد ہوا ہو، تو نسب ثابت مانا جائے گا، حضرت سعد بن ابی وقاص اور عبد بن زمعہ کا عبدالرحمٰن نامی بچہ کی بابت نزاع حدیثوں میں معروف ہے، حقیقت میں عتبہ ابن ابی وقاص نے عبدالرحمٰن کی ماں جو زمعہ کی باندی تھی، اس سے زنا کیا تھا، اور جاہلی دستور کے مطابق اپنے بھائی سعد کو اس بچے کے تئیں وصیت کردی تھی، فتح مکہ کے موقع پر حضرت سعد وحضرت عبد بن زمعہ کے مابین اسی بچے کو لینے کی بابت نزاع ہوا، معاملہ دربار رسالت تک پہنچا، اللہ کے رسول نے ہر چند کہ بچہ عتبہ کا ہم شکل تھا مگر اس کا نسب زمعہ سے ثابت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هو لك يا عبد، والولد للفراش وللعاهر الحجر (بخاری: ۲/۱۰۰۱، کتاب الحدود، باب بن ادعی أخا الخ)

''یہ تمہارا بھائی ہے عبد! بچہ صاحب فراش کا ہوتا ہے، اور زانی کے لیے پتھر ہوتا ہے''۔

اس فراش کی فقہاء نے تفصیل کی ہے، اس کو یہاں پر نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

علامہ شامی فرماتے ہیں: ''فراش کے چار مراتب ہیں: (۱) ضعیف: اور یہ باندی ہے اس میں نسب بغیر دعوی ثابت نہیں ہوگا، (۲) متوسط: اور وہ ام ولد کا فراش ہے پس اس میں بغیر دعوی ثابت ہوجائے گا لیکن انکار کرنے پر منتفی ہوجائے گا، (۳) قوی: منکوحہ کا فراش نیز مطلقہ رجعیہ ہیں، بغیر لعان نسب کی نفی نہیں ہوگی، (۴) اقوی: جیسے مطلقہ بائنہ کا فراش ہے پس اس میں کبھی بھی منتفی نہیں ہوگا کیوں کہ نفی لعان پر موقوف ہے اور لعان کی شرط بیوی ہونا ہے'' (ردالمحتار: ۲/۶۸۴، ثبوت النسب، ط: رشیدیہ)

تاتارخانیہ میں ہے: ''ہمارے اصحاب نے فرمایا: ثبوت نسب کے تین مرتبے ہیں، (۱) نکاح صحیح اور اسی معنی میں نکاح فاسد بھی ہے، اس میں حکم بغیر دعوی ثابت ہوگا اور بغیر لعان نسب کا انتفاء نہیں ہوسکتا پس اگر ان میں سے نہ ہو جن کے مابین لعان ہوتا ہے تو بچہ کا نسب منتفی نہیں ہوگا۔ (۲) ام ولد: اس میں حکم یہ ہے کہ بغیر دعوی نسب ثابت ہوگا لیکن انکار سے منتفی ہوجائے گا۔ (۳) باندی جب کہ بچہ پیدا ہوا اس میں حکم یہ ہے کہ نسب بغیر دعوی ثابت نہیں ہوگا''۔ (تاتارخانیہ: ۵/۲۶۰، ثبوت النسب، الفصل ۲۹، مسئلہ ۷۷۹۴)

خلاصہ اس کا یہ ہے کہ چار اسبابِ فراش ہوتے ہیں جن کی بنا پر نسب ثابت ہوتا ہے، ایک اور شکل اقرار بالنسب کی ہوتی ہے۔ گویا نسب کے ثبوت کے لیے ان پانچ شکلوں میں سے کسی کا وجود ضروری ہے۔

(۱) نکاح: یعنی بچہ جس عورت سے پیدا ہورہا ہے وہ کسی کی منکوحہ ہے اور وطی کا تصور ممکن ہے تو نسب شوہر سے ثابت ہوگا خواہ شوہر اعتراف کرے یا نہ کرے، یا انکار ہی کیوں نہ کردے، ہاں انکار کی صورت میں لعان کی نوبت آجائے تو لعان کے بعد نفی کی جائے گی۔

البتہ چھ ماہ سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو نکاح کے وقت اس کا غیر سے حاملہ ہونا یقینی ہے اس لیے شوہر سے نسب ثابت نہیں ہوگا، نیز حنفیہ کے نزدیک وطی کا تصور کافی ہے خواہ حقیقتاً وطی نہ ہوئی ہو اسی وجہ سے اس طرح کی تصریح ملتی ہے:

قد اكتفوا بقيام الفراش بلا دخول كتزوج المغربي بمشرقية بينهما سنة، فولدت لستة أشهر منه تزوجها لتصوره كرامة أو استخداما (درمختار علی رد المحتار: ۲/۶۸۴، ثبوت النسب، ط: رشیدیہ)

(بغیر وطی فراش اگر قائم ہے تو کافی ہے، جیسے مغربی شخص نے مشرق کی رہنے والے خاتون سے نکاح کیا، دونوں کے مابین ایک سال کی مسافت ہے، پس چھ ماہ میں بچہ پیدا ہوا، (تو نسب ثابت ہوگا) دخول کا تصور کرامت کے طور پر یا استعمال واستخدام کے طور پر موجود ہونے کی وجہ سے)

لیکن دخول کا تصور نہیں ہے تو پھر نسب کا ثبوت نہیں ہوگا، جیسے صبی غیر مراھق کی بیوی کو بچہ پیدا ہوا تو نسب ثابت نہیں ہوگا۔

والحق أن التصور شرط والذا لو جاء ت امرأة الصبي بولد لا يثبت نسبه (ردالمحتار: ۲/۶۸۴، ثبوت النسب، رشیدیہ)

(صحیح یہ ہے کہ تصور شرط ہے، اسی وجہ سے اگر صبی کی بیوی کو بچہ پیدا ہوا تو نسب ثابت نہیں ہوگا)

بہرحال ایسا نکاح جس میں وطی کا تصور ہو ثبوت نسب کے لیے بہت ہی قوی سبب ہے، انکار کی صورت میں بھی بچہ ثابت النسب سمجھا جائے گا، ہاں لعان بچہ کی نفی کی وجہ سے ہو تو الگ بات ہے، نیز لعان والے مسئلہ میں بھی نسب تو ثابت رہتا ہے صرف وراثت ونفقہ کے باب میں اس کو ماں کے ساتھ لاحق کیا جاتا ہے۔

وصرحوا ببقاء نسبه بعد القطع في كل الأحكام لقيام فراشها إلا في حكمين: الإرث والنفقه فقط حتى لا تصح دعوة غير النافي وإن صدقه الولد (در مختار: ۲۰/۶۴۳، باب اللعان، آخر الفروع)

(فقہاء نے صراحت کی ہے کہ باپ سے منقطع کردینے کے بعد تمام احکام میں نسب باقی رہتا ہے اس لیے کہ فراش قائم ہے، مگر دو حکم: میراث اور نفقہ میں باقی نہیں رہتا، حتی کہ غیر نافی کا دعوی صحیح نہیں ہوگا خواہ بچہ تصدیق کرے)۔

اسی کے حکم میں نکاح فاسد بھی داخل ہے۔

(۲): وہ صورت جس میں من وجہٍ بیوی کے احکام جاری رہتے ہیں مگر بیوی نہ ہونے کی وجہ سے لعان نہیں ہوسکتا ہے جیسے مطلقہ بائنہ کو دو سال سے پہلے بچہ پیدا ہوگیا تو اس کا نسب باپ سے ثابت ہوگا، اسی میں وطی بالشبہ بھی داخل ہے، فقہاء کی تصریح ہے:

النسب كما يثبت بالنكاح الصحيح يثبت بالنكاح الفاسد وبالوطي عن شبهة وبملك اليمين (ہدایہ: ۲/۴۳۴، باب ثبوت النسب)

(نسب جس طرح نکاح صحیح سے ثابت ہوتا ہے، نکاح فاسد سے اور وطی بالشبہ اور ملک یمین سے بھی ثابت ہوتا ہے)۔

(۳) ام ولد سے پیدا ہونے والا بچہ: اس کا نسب بھی مولی سے ثابت ہوگا، اس سے اس وقت نسب منتفی ہوگا جبکہ انکار پایا جائے۔

(۴) مملوکہ باندی سے بچہ پیدا ہو تو نسب کا ثبوت اقرار پر موقوف ہوگا، جبکہ غیر شادی شدہ ہو، اگر منکوحہ ہے تو اس کے شوہر سے نومولود کا نسب ثابت ہوگا بشرطیکہ وطی کا تصور ممکن ہو۔

(۵) اقرار بالنسب: ثبوت نسب کے لیے پانچواں سبب ہے بشرطیکہ چند شرائط موجود ہوں، (الف) ایسے شخص کے بارے میں اقرار ہو جو مجہول النسب ہو۔ (ب) نسب کے جس نوع کا اقرار کر رہا ہو وہ ممکن ہو۔ (ج) مقرلہ تصدیق بھی کرتا ہو۔ (د) اس اقرار کا تعلق غیر سے نہ ہو۔ (بدائع: ۶/۲۶۴، کتاب الاقرار، الاقرار بالنسب، زکریا)

بہرحال اسی کو ائمہ ثلاثہ استلحاق سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس کے لئے چند شرطیں لگاتے ہیں، ایک یہ کہ اس قسم کا بچہ اس قسم کے مُقِر سے پیدا ہوسکتا ہو، اور یہ کہ مجہول النسب ہو، مقرلہ اس کی تکذیب نہ کرے، وغیرہ۔ ان پانچ اسباب میں سے آخری اور شروع کے دو اسباب باقی رہ گئے ہیں، چوں کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں لعان نہیں ہے اس لیے اب دونوں ہی قسموں کا حکم یہی ہوگا کہ نسب کا ثبوت انکار کے باوجود ہو جائے گا، اس تفصیل کی روشنی میں ہم ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ حاصل ہونے والی اولاد کا حکم دریافت کر سکتے ہیں:

(۱) زوجین کے نطفے کی ٹیوب ہی میں پرورش ہو: ٹیسٹ ٹیوب کے ذریعہ بچے کے حصول کے مختلف طریقے ہیں، اس کی ایک شکل یہ ہوتی ہے کہ زوجین کے نطفے یعنی مرد کا مادۂ تولید اور عورت کا بیضہ لیا جاتا ہے اور مصنوعی ٹیوب میں دواؤں کی آمیزش کے ساتھ پرورش کی جاتی ہے، اور اسی ٹیوب میں رہتے ہوئے بچے کی تیاری عمل میں آتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسے نومولود کا نسب کس سے ثابت ہوگا، یہ بات تو اپنی جگہ حقیقت ہے کہ یہ بچہ زوجین کا جزء ہے، جزئیت وبعضیت کی وجہ سے حرمت مصاہرت کا ثبوت ہوتا ہے، مگر حرمت مصاہرت ثابت ہونے سے لازم نہیں ہے کہ نسب کا ثبوت بھی ہو، ثبوت نسب کا مدار فراش وشرعی اقرار پر ہے، لہذا حرمت مصاہرت تو ثابت ہو جائے گی مگر بچہ کا نسب ثابت ہوگا یا نہیں، ناچیز کے خیال میں اس قسم کے بچے کا حکم ''لقیط'' کا ہے، لقیط کا نسب اس وقت ثابت ہوتا ہے جبکہ ملتقط یا کوئی اور دعوی کرے۔

الموسوعۃ الفقہیۃ: ۳۵/ ۳۱۸ (لقیط) میں ہے: ''جس لقیط کا کوئی شخص دعوی کرے خواہ وہ ملتقط ہو یا دوسرا، پس اگر مدعی مسلمان آزاد ہے تو اس کا نسب اس کے ساتھ لاحق ہوگا اگر ممکن ہو بایں طور کہ اس میں استلحاق کی شرطیں موجود ہوں، یہی رائے شافعیہ اور حنابلہ کی ہے؛ اس لیے کہ نسب کا اقرار بچہ کے لیے نفع محض ہے نسب کے موجود ہونے کی وجہ سے، اس میں کسی پر مضرت نہیں ہے پس قبول کیا جائے گا جیسا کہ اگر مال کا اقرار کرے''۔

ہدایہ: ۲/۶۱۲، باب اللقیط میں ہے: ''پس اگر کوئی مدعی دعوی کرے کہ یہ اس کا بیٹا ہے تو اس کے قول کا اعتبار ہوگا، مطلب یہ ہے کہ جب ملتقط اس کے نسب کا دعوی نہ کرے، یہ استحسان ہے، اور قیاس یہ کہ اس کا قول قبول نہیں ہوگا، اس لیے کہ ملتقط کے حق کے ابطال کو متضمن ہے، استحسان کی وجہ یہ ہے کہ یہ بچے کے لیے ایسی چیز کا اقرار ہے جو اس کے لیے نافع ہے؛ اس لیے کہ نسب سے شرف حاصل ہوگا اور نہ ہونے سے عار ہوگا، اور اگر ملتقط دعوی کرے تو کہا گیا ہے کہ قیاسا واستحسانا صحیح ہے، اور اصح یہی ہے کہ قیاس واستحسان کے مطابق ہے''۔

اس لیے اگر زوجین یا کوئی ایک دعوی کرتا ہے تو نسب اس سے ثابت ہوگا، ورنہ مجہول النسب سمجھا جائے گا۔

(۲) پیدا زوجہ کے بطن سے ہو خواہ کچھ وقت کے لیے ٹیوب میں پرورش ہوئی ہو: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ زوجین کے نطفے ٹیوب میں رکھے جاتے ہیں، بارآور کرنے کے بعد پھر رحم میں منتقل کر دیا جاتا ہے،

پیدائش اسی عورت کے رحم سے ہوتی ہے جس کا نطفہ ہوتا ہے، ایسی صورت میں چوں کہ فراش موجود ہے اس لیے اس نومولود کا نسب ماں و باپ دونوں یعنی زوجین سے ثابت ہوگا، ثبوت نسب کے لیے ضرورت نہیں ہے کہ زوجین آپس میں مباشرت کیے ہوں، آخر مجبوب یعنی مقطوع الذکر کی زوجہ سے اگر بچہ پیدا ہوتو نسب مجبوب شوہر سے ثابت ہوتا ہے؛ کیوں کہ احتمال ہے کہ سحق ومس کی وجہ سے انزال ہوا ہو، اور وہ منی اندر کو پہنچ گئی ہو۔

(۳) شوہر اور اجنبی عورت کے مادے کو قابل تولید بنانے کے بعد بیوی سے پیدائش: ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی ایک گھناؤنی شکل یہ بھی اپنائی جاتی ہے کہ شوہر کی منی اور کسی اجنبی عورت کا بیضہ حاصل کیا جاتا ہے اور باہم دونوں کو مخلوط کر کے دواؤں کے ذریعہ اس کو قابلِ تولید بنایا جاتا ہے پھر اس کو جس شوہر کی منی ہے اس کی بیوی کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہے، اور اس طرح بچے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔

جہاں تک اس فعل کی قباحت کا تعلق ہے تو اس کے گھناؤنے ہونے میں کوئی شک نہیں ہے؛ کیوں کہ ایک ایسی عورت کے مادہ سے منی کا اختلاط کیا جا رہا ہے جس سے شرعا اس مرد کے لیے استمتاع جائز نہیں ہے، مگر جہاں تک بات ثبوت نسب کی ہے تو نسب اس عورت سے جس کے رحم سے پیدائش ہو رہی ہے اور اس کے شوہر سے ثابت ہو جائے گا اس لیے کہ مرد کی فراش سے پیدائش ہو رہی ہے جو ثبوت نسب کے لیے قوی سبب ہے۔

اجنبی عورت سے نسب تو ثابت نہیں ہوگا مگر اس لحاظ سے کہ بچہ اس کے بیضہ سے پیدا ہوا ہے جس سے جزئیت ثابت ہو جاتی ہے، جزئیت کی بنا پر نسب کا ثبوت تو نہیں ہوتا ہے ہاں حرمت مصاہرت ثابت ہوتی ہے۔

والثانی یحرم علی الرجل بنته من الزنا بصریح النص المذکور، لأنها بنته لغة، والخطاب إنما هو باللغة العربیة ما لم یثبت نقل کلفظ الصلاة ونحوه فیصر منقولا شرعیا. (فتح القدیر: ۳/۲۰۹، کتاب النکاح، باب المحرمات ط: مصر)

(دوم یہ کہ مرد پر زنا سے پیدا ہونے والی لڑکی حرام ہے مذکورہ نص صریح کی وجہ سے؛ اس لیے کہ وہ اس کی بیٹی ہے لغۃ، خطاب عربی زبان میں ہے جب تک نقل ثابت نہ ہو جیسے صلاۃ کا لفظ وغیرہ کہ یہ منقول شرعی ہے)

حرمتِ مصاہرت کے ثابت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ اجنبی عورت اس بچے کے لیے حرام ہوگی۔

(٤) بیوی کے بیضہ کے ساتھ اجنبی مرد کے مادہ تولید کی آمیزش سے حصول اولاد: کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیوی کے بیضہ میں تولید کی صلاحیت ہوتی ہے جبکہ شوہر کا مادۂ منویہ کمزور وضعیف ہوتا ہے تو کسی اجنبی مرد کا مادۂ تولید لے کر بیوی کے بیضہ کے ساتھ آمیزش کی جاتی ہے، پھر بیوی کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہے، بعدہ وقت پر پیدائش بیوی کے بطن سے ہوتی ہے، اس نومولود کا نسب کس سے ثابت ہوگا، نیز جس مرد کا مادۂ تولید لیا گیا ہے اس سے اس بچہ کا رشتہ کیا ہوگا۔

اس صورت کا حکم بعینہ اوپر والے مسئلہ کا حکم ہے، یعنی فراش ہونے کی وجہ سے نسب زوجین سے ہی ثابت ہوگا البتہ جس مرد کا مادۂ تولید ہے اس سے نسب کا ثبوت تو نہیں ہو سکے گا، ہاں جزئیت ثابت ہوگی جس کی بنا پر بچہ اور اس کے اصول وفروع سب میں حرمت آجائے گی، حرمت مصاہرت کا مدار جزئیت پر ہے، اور ثبوت نسب کا مدار فراش ہونے پر یا اس دعوی پر جو ممکن بھی ہو۔

(۵) زوجین کا مادۂ منویہ ہو مگر پرورش دوسری عورت کے رحم میں ہو: بیوی کا رحم تحملِ حمل کی صلاحیت نہیں رکھتا، نیز شوہر کا مادہ بھی کمزور و ناقابل تولید ہوتا ہے تو ایسے موقع پر زوجین کے مادۂ منویہ کو لے کر ٹیوپ میں پرورش کی جاتی ہے، پھر اس مادہ کو کسی دوسری عورت کے رحم میں رکھ کر پیدائش کرائی جاتی ہے، اس عمل کی قباحت وشناعت سے قطع نظر بچہ کا تعلق زوجین

سے کس قسم کا ہوگا، نیز جس کے بطن سے پیدا ہوا اس سے تعلق کیا ہوگا۔

اگر عورت منکوحہ ہے تو ناقص رائے میں اس بچہ کا نسب اس عورت سے ثابت ہوگا جس سے پیدائش ہوئی ہے، قرآن کریم نے إن أمهاتهم إلا اللائی ولدنهم (مجادلہ) کہا ہے، یعنی جو عورتیں بچوں کو جنتی ہیں وہی ان کی مائیں کہلاتی ہیں، لہذا نسبی ماں ہونے کا مدار پیدائش پر ہے، پس جننے والی عورت ماں اور اس کا شوہر باپ کہلائے گا، موسوعہ میں مالکیہ کے حوالہ سے ایک جزئیہ منقول ہے اس سے استیناس کیا جاسکتا ہے:

قال المالكية: إذا حملت المرأة من منى دخل فرجها من غير جماع كحمام ونحوه فيلحق الولد بزوجها إن كانت ذات زوج وأمكن إلحاقه به بأن مضى من يوم تزوجها ستة أشهر فأكثر، فإن لم تكن ذات زوج أو كانت لكن لا يمكن إلحاقه به لم يلحقه. (الموسوعۃ: ۴۰/ ۲۳۷، نسب، مع حوالہ حاشیہ الدسوقی ۱/ ۶۳۰)

(مالکیہ نے کہا: عورت حاملہ ہو اس منی سے جو اس کے فرج میں بغیر جماع کے داخل ہوئی ہو تو بچہ اس کے شوہر کے ساتھ لاحق ہوگا اگر شوہر والی ہو اور الحاق ممکن ہو بایں طور کہ شادی سے چھ ماہ یا اس سے زیادہ میں پیدائش ہو، پس اگر شوہر والی نہ ہو، یا شوہر والی ہو مگر الحاق ممکن نہ ہو تو لاحق نہیں ہوگا)۔

اس کو زنا کے ذریعہ حمل پر بھی قیاس کیا جاسکتا ہے، ایسے بچے کا نسب حاملہ زانیہ کے شوہر سے ثابت ہوتا ہے بشرطیکہ نسب ثابت کرنا ممکن ہو، ہاں اس بچہ کا نطفہ والے زوجین سے تعلق محض جزئیت کا ہوگا اور حرمت مصاہرت ثابت ہوگی۔

(۶) اجنبی مرد و اجنبی عورت کے نطفے کو بار آور کرکے شوہر اپنی منکوحہ سے پیدا کرائے: اگر کوئی شوہر اجنبی مرد اور اجنبی عورت کا نطفہ حاصل کرکے اس کو اپنی منکوحہ سے پیدائش کرائے تو اس کا حکم بھی الولد للفراش کے مطابق یہی ہوگا کہ نسب اس سے ہی ثابت ہوگا، اور اجنبی مرد و عورت سے جزئیت کا تعلق ہونے کی وجہ سے حرمت، مصاہرت ان دونوں سے بھی متعلق ہوجائے گی۔

(۷) ایک سوکن کا نطفہ ہو، اور دوسری سوکن کے بطن سے پیدا ہو: معاملہ بڑا دلچسپ ہوجاتا ہے جب ایک شخص کی دو بیویاں ہوتی ہیں، ایک کا رحم حمل کا تحمل نہیں کر پاتا، جبکہ دوسری کے بیضہ میں وہ قوت نہیں جو بچہ کی پیدائش کے لیے درکار ہے، تو شوہر ایک بیوی کا بیضہ اور اپنا مادۂ تولید لے کر اس بیوی کے رحم میں داخل کرواتا ہے جو حمل کی متحمل ہوسکتی ہے، اس طرح ایک کا بیضہ ہوتا ہے اور دوسری کا رحم ہوتا ہے، بچہ پیدا ہونے کے بعد کس کا سمجھا جائے، اتنی بات تو طے ہے کہ شوہر کا درجہ باپ کا ہوگا، مگر ان دونوں سوکنوں کو کیا درجہ دیا جائے، ایک احتمال تو یہ ہے کہ دونوں کو ہی ماں کا درجہ دیا جائے، ایسی نظیر فقہی ابواب میں ملتی بھی ہے کہ ایک بچہ کا نسب دو شخصوں سے برابر برابر ثابت ہوجائے، تاتارخانیہ میں ہے:

إذا كانت الجارية بين رجلين فجاء ت بولد فادعياه حتى يثبت النسب منهما وصارت الجارية أم ولد لهما (تاتارخانیہ: ۵/ ۵۶۹، کتاب العتاق، الفصل الثانی عشر)

''باندی دو شخص کی ہو، وہ ایک بچہ جنی ہو دونوں نے دعوی کیا تو نسب دونوں سے ثابت ہوگا اور باندی دونوں کی ام ولد ہوجائے گی''

اسی طرح لقیط کی بابت دو عورتیں اگر دعوی کرتی ہیں تو امام ابوحنیفہ دونوں کو ماں قرار دیتے ہیں:

ان ادعته امرأتان وأقامت إحداهما البينة فهي أولى به، وإن أقامتا بينتين فهو بينهما عند أبي حنيفة و عند أبي يوسف لايكون لواحدة منهما، وعن محمد روايتان (سوعوہ: ۳۵/ ۳۲۲، لقیط)

رضاعت کے مسئلہ سے بھی استنباط ہوتا ہے کہ ایک نومولود کو اگر متعدد عورتیں مدت رضاعت میں دودھ پلا دیتی ہیں تو سب رضاعی مائیں ہوجاتی ہیں، اس لیے ایک احتمال یہ ہے کہ ایسے بچہ کو جس کی

پرورش ایک سوکن کے رحم میں ہوئی ہو جبکہ بیضہ دوسری سوکن کا ہو دونوں کا بچہ قرار دیا جائے، بعض اکیڈمی کا فیصلہ اس بابت ایسا ہے بھی۔

مگر غور کرنے سے اس کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جن شواہد کو متعدد ماں بنانے کے لئے پیش کیا جاتا ہے ان میں اور زیر بحث صورت میں بہت فرق ہے، قرآن کریم نے ماں کو ''والدۃ'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، اسی طرح إن إمهاتهم إلا اللائی ولدنهم ،(ان کی مائیں وہ ہیں جنہوں نے ان کو جنا ہے) یعنی ماں وہ ہوتی ہے جو بچہ جنتی ہے، یہاں پر بچہ جننے والی وہ ہے جس کے رحم میں پرورش ہوئی ہے، اس جننے والی سے ہی ماں کا رشتہ قائم ہوگا۔

لقیط و رضاعت میں تعدد امہات اس لیے ہے کہ ہر طرف جہت برابر ہے، کسی کے ساتھ کوئی وجہ ترجیح یا قرینہ نہیں ہے، اگر مسئلہ کی صورت یوں ہو کہ ایک کے پاس بینہ ہو دوسرے کے پاس نہ ہو تو بینہ ہونا قرینہ راجح ہے اس لیے بینہ والی خاتون مدعی ماں سمجھی جاے گی، اسی طرح دو مولی مشترک باندی کے بچہ کے بارے میں دعوی کرتے ہیں، یہاں بھی ایک کو دوسرے پر راجح کرنے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہوتی اس لیے دونوں سے برابر کا رشتہ قائم کیا جاتا ہے، اگر ایک مدعی ہو دوسرا نہ ہو، پھر تو بچہ مدعی کا سمجھا جائے گا، ساکت شخص سے نسب ثابت نہیں ہوگا، یہاں تو ایک کا رحم اس نومولود کے لیے پرورش گاہ رہا ہے، اسی کے جسد سے تولد ہوا ہے، دوسری سوکن اس کی ہم سری نہیں کرسکتی ہے اس لیے ماں بننے کی مستحق وہی ہے، ہاں دوسری کا نطفہ بھی شامل ہے اس لیے اس سے جزئیت کا تعلق قائم ہوگا جو حرمت مصاہرت میں مفید ہوگی، رشتۂ نسب کو استوار کرنے میں کافی نہیں ہے۔

خلاصہ:

(۱) ٹیسٹ ٹیوب کی مدد سے بچہ کی حصول یابی فطرتِ انسانی کے خلاف ہے اور شرعی طور پر نامناسب ہے، خواہ زوجین کے مادے کو ہی بارآور کیا گیا ہو۔

(۲) ثبوتِ نسب کی بابت اسلام کا اصول ''فراش'' اور مجہول النسب شخص کے بارے میں ''شرعی اقرار'' ہے۔

(۳) زوجین کے مادہ کو ٹیسٹ ٹیوب میں رکھ کر بارآور کیا جائے اور بچہ کی تیاری رحم مادہ میں بالکل نہ ہو تو اس نومولود کا حکم لقیط کا ہوگا، اگر کوئی دعوت کرنے والا ہوگا تو اس سے نسب ثابت ہوگا ورنہ مجہول النسب باور کیا جائے گا۔

(۴) اگر زوجین کے نطفے کو تھوڑے دنوں مصنوعی آلہ میں رکھ کر پھر زوجہ کے رحم میں رکھ دیا جائے اور بطنِ زوجہ سے بچہ کا تولد ہو تو نسب زوجین سے ثابت ہوگا۔

(۵) اگر زوجین میں سے ایک کا مادۂ تولید ہو اور دوسرے کسی اجنبی مرد یا اجنبیہ عورت کے نطفے سے اختلاط کیا جائے پھر ٹیسٹ ٹیوب میں بارآور کرنے کے بعد زوجہ کے رحم میں رکھ دیا جائے تو بھی نسب زوجین سے ثابت ہوگا۔ اجنبی مرد و عورت سے جزئیت کا تعلق ہوگا جس کی وجہ سے حرمت مصاہرت آئے گی۔

(۶) زوجین کے مادۂ منویہ کی پرورش کسی اجنبی خاتون کے رحم میں ہوا اور وہ اجنبیہ شوہر والی ہو تو نومولود کا نسب اسی اجنبیہ اور اس کے شوہر سے ثابت ہوگا، جن زوجین کا نطفہ ہے، ان سے جزئیت کا تعلق ہوگا، یعنی حرمت مصاہرت ثابت ہوگی۔

(۷) اگر اجنبی مرد و عورت کا نطفہ حاصل کر کے اس کی پرورش کسی شوہر والی خاتون کے رحم میں ہو تو نومولود کا نسب اسی خاتون اور اس کے شوہر سے ثابت ہوگا جس کے بطن سے پیدائش ہوئی ہے۔

(۸) اگر ایک سوکن کا بیضہ ہو اور اس کو شوہر کے مادہ سے مخلوط کر کے دوسری سوکن کے رحم میں پرورش کروائی جائے تو بچہ کی ماں وہ سوکن کہلائے گی جو جننے والی ہوگی، جس سوکن کا بیضہ ہے اس سے صرف حرمت مصاہرت ثابت ہوگی۔

☆☆☆

تعارف و تبصرہ

تبصرہ نگار: کمال اختر قاسمی

نام کتاب: معلم انسانیت کا نظام تعلیم وتربیت

مصنف: مجیب الرحمٰن عتیق

صفحات: ۱۱۸ قیمت: ۱۸۰

ناشر: ادارہ تحقیق وفکر اسلامی، سنبھل

ملنے کے پتے: مکتبۃ الشباب، لکھنؤ، مکتبہ ندویہ، لکھنؤ

ظلمت وتاریکی اور گھٹا ٹوپ اندھیروں کو دور کرنے کے لئے انبیاء کرام کے ذریعہ نور الٰہی کی قندیلیں روشن کی گئیں، جن سے انسانیت کو ظاہری آنکھوں سے نظر آنے والی روشنی کے ساتھ ساتھ قلب وروح کو منور کرنے والی روشنی بھی حاصل ہوتی رہی۔

آخری رسولِ محمد بن عبداللہ ﷺ کی بعثت کے وقت لوگوں میں معرفت الٰہی کو حاصل کرنے والا اور حیات انسانی بہتر بنانے والا ذریعہ علم کا زبردست فقدان تھا، بلاذری فتوح البلدان میں لکھتے ہیں کہ پورے مکہ اور اطراف میں صرف ۱۵ آدمی تھے جو کچھ کچھ لکھ پڑھ سکتے تھے۔

علم کے فقدان کا لازمی نتیجہ تھا طرز معاشرت اور اخلاقیات کے اصول سے ناآشنائی، ان حالات میں اللہ کے رسول ﷺ نے علم و تعلیم کی بناء ڈالی، اور باقاعدہ تعلیم کا نظام قائم فرمایا۔

اللہ کے رسول ﷺ کے نظام تعلیم میں صرف عبادت و ریاضت، طہارت وغسل، مسواک وکلاہ، جبہ ودستار کی فضیلت ہی شامل نہ تھی جسے ہم آج اپنے تعلیمی زوال کو دیکھ کر خود کو مطمئن کرنے اور دیگر اقوام کے عروج کو دیکھ کر خود کو تسلی دینے کے لئے دینی تعلیم کا نام دے دیتے ہیں، بلکہ اللہ کے رسول کے نظام تعلیم میں ترقی و ارتقاء کے تمام اصولوں کی طرف راہنمائی ملتی ہے۔

آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ تعلیم سے ناآشنائی عام تھی، جگہ جگہ متعدد مسجدیں بنوائیں اور ان میں تعلیم کا منظم انتظام فرمایا، جنھیں آج کی زبان میں عظیم الشان مدرسہ اور جامعہ کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ وہاں انسانی زندگی اور انسانی ضرورتوں سے متعلق تمام معلومات فراہم کی جاتی تھی، عبادات وریاضات، اخلاقیات ومعاملات کے علاوہ سیاسی ومعاشی اصول بھی سمجھائے جاتے، متعدد حکمرانوں کو خطوط بھیج کر تعلقات خارجہ کے اصول وضوابط بھی سکھائے جاتے، قرآنیات سے لے کر سماجیات، حسابات الغرض تمام ضروری فنون کے ماہرین کی عظیم الشان جماعت چند سالوں میں تیار کر دی گئی، حیف سکریٹیٹ کے لئے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے متعدد صحابہ کو اردگرد کی مختلف زبانیں سکھائی گئیں، بہت سے صحابہ نے فارسی، ایتھوپین، سریانی، عبرانی، شامی اور یونانی زبانیں سیکھ لی تھیں۔

اللہ کے رسول کے نظام تعلیم میں قانون (Law) دینیات (Theology) اخلاقیات (Moral Science) سماجیات، طب، علم الکفلکیات (Astornomy) زراعت، تجارت، بزنس، خارجہ پالیسی غرضیکہ تمام ضروری موضوعات پر مہارت پیدا کرائی جاتی تھی، چنانچہ بعض صحابہ بیک وقت ان تمام فنون کے اور بعض صحابی بعض فن کے ماہر ہوا کرتے تھے۔

خواتین کے لئے باقاعدہ تعلیم کا نظم قائم کیا گیا، بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کے ارشادات میں بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں کو ان علوم سے آراستہ کرنے کی تاکید ملتی ہے۔

ایک موقع سے اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"ثلاثة يوتون اجرهم مرتين، الرجل تكون له الامة فيعلمها فيحسن تعليمها ويؤدبها فيحسن أدبها، (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر، باب فضل من اسلم من اھل الکتابین ۲۸۴۹)

یعنی تین طرح کے لوگ ہیں جن کو دوہرا اجر دیا جاتا ہے، ایک وہ جس کے پاس کوئی باندی (لڑکی) ہو اسے اچھی تعلیم دے، اور اس کی اچھی تربیت کرے۔

آج مغرب کو جن علوم پر ناز ہے، اور ناز بھی بجا بھی ہے، بلکہ جن علوم سے مغرب نے دنیا کو مسخر کر رکھا ہے، خاص کر عالم اسلام پر تسلط حاصل کر کے مسلمانوں کو رسوا کر رکھا ہے، دراصل ان علوم کا دروازہ بنی آخر الزماں ﷺ نے ہی کھولا تھا، لیکن افسوس کہ مسلمان ان علوم کو نہ سنبھال سکے۔

قرآن مجید کی بے شمار آیات کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ کے ان ارشادات پر غور فرمائیے جن سے علوم و معارف اور اکتشافات وانکشافات کی مضبوط ترین بنیادیں فراہم ہوتی ہیں، اور جن پر یوروپ نے قبضہ کر کے دنیا کو مسخر کرنے کے ساتھ ساتھ محسن کائنات ہی کی امت کو خاص طور پر اپنے پنجۂ استبداد میں جکڑ لیا ہے۔

مثال کے طور پر نیوٹن، آئن اسٹائن کے سر پر Laws of Motion یعنی قوانین حرکت کا سہرا سجایا جاتا ہے، جو کہ بہت بعد کے سائنس داں ہیں، کیا اس حدیث سے قوانین حرکت کی طرف اشارہ نہیں ہوتا؟

عن ابی ذر أنه قال لقد تركنا محمد (ﷺ) وما يحرك طائر جناحيه فی السماء إلا اذكرنا منه علما. (احمد بن حنبل، مسند احمد، ۲۱۳۹۹)

آسمان میں جو پرندہ اپنے پروں کو حرکت دیتا ہے اللہ کے رسول نے اس کے علم کا بھی ہم سے تذکرہ کر دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

قام فينا النبی مقاما، فأخبرنا عن بدء الخلق حتی دخل اهل الجنة منازلهم واهل النار منازلهم، حفظ ذلك من حفظه ونسيه من نسيه۔

یعنی اللہ کے رسول ہمارے درمیان آ کر ہمیں مخلوق کی ابتدا سے لے کر اہل جنت کے جنت میں اور اہل جہنم کے جہنم میں داخل ہونے تک کی خبر دے دی، جس نے جو یاد رکھا وہ یاد رکھا اور جس نے بھلا دیا، بھلا دیا۔

حدیث پہ غور کیجئے تو اندازہ ہوگا کہ تخلیق کائنات سے لے کر اس کے اختتام تک کی کس قدر تفصیل بتائی گئی ہوگی کہ سب یاد بھی نہ رکھی جا سکی۔ یہ اس قوت انسانوں کے لئے نئی انکشافات ہی تو تھیں جن پر بعد میں چل کر علوم اور تحقیقات کی بنیاد رکھی گئی۔

ایک اور حدیث ملاحظہ کیجئے:

اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"سيكون فی آخر امتی رجال يركبون علی سروج كاشباه الرجال" (صحیح ابن حبان، ۵۷۵۳)

میری امت کے آخری دور میں لوگ (اونٹ، گھوڑے، یا پیدل) سواری کے بجائے بڑی بڑی نئی سواریوں پر سوار ہوں گے۔

روایت کے الفاظ پہ غور کیجئے، جس وقت یہ بات کہی جا رہی ہے اس وقت لوگ اونٹ، گھوڑے، گدھے پر سواری کے علاوہ اور کسی تیز رفتار سواری کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے، اب اہل فہم کی ذمہ داری ہے کہ وہ نئی سواریوں کو تلاش کریں، اس میں اشارہ ہے کہ جو قوم ان سواریوں کی تخلیق و ایجاد کے گُر حاصل کر لے گی وہ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے کرے گی، اور اس کو دنیا پر غلبہ و تسلط حاصل ہوگا، اور جو قوم ان انکشافات کو زائد از ضرورت کہہ کر اپنے عیوب زوال پر پردہ ڈال کر سست روی کی شکار ہوگی اسے گدھے گھوڑے جیسے بطوء رفتار سواریوں پر قناعت کرنا پڑے گی یا وہ ترقی یافتہ اقوام کی محتاج محض ہو کر اپنا سب کچھ ان کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگی۔

ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے، جس میں اللہ کے حبیب ﷺ نے فرمایا: سیکون آخر هذه الأمة رجال یرکبون علی المیاثر، فقلت لا بی وما المیاثر؟ قال: سروجا عظاما۔ (حاکم، المستدرک، ۸۳۴۸)

یعنی اس امت کے آخری دور میں لوگ میاثر پر سفر کریں گے، راوی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا میاثر کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا بڑی بڑی سواریاں۔

میاثر کا لفظ اس سوسائٹی میں بالکل بھی معروف نہیں تھا اور نہ ہی لوگ اس کے معانی سمجھتے تھے، اسی لئے تو سننے والے نے سوال کر دیا کہ ''میاثر'' کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میاثر موثر کی جمع ہو، اور عربی زبان میں ''ث'' کا تلفظ نہیں ہوتا، اس لیے موثر ہی مراد ہو۔

اس حدیث میں میکانیکل سائنس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایک موقع سے اللہ کے رسول نے ارشاد فرمایا: والذی نفسی بیده لا تقوم الساعة حتی تکلم السباع الإنس

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، قیامت اس وقت نہیں واقع ہوگی، یہاں تک کہ درندے انسانوں سے کلام کرلیں گے۔

اسی روایت میں ہے: حتی تکلم الرجل عذبة سوطه وشراك نعله۔ (سنن ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی کلام السباع، ۲۱۸۱)

یعنی انسان سے اس کے کوڑے کی رسی اور جوتے کا تسمہ بھی کلام کرے گا۔

حدیث کا مفہوم واضح ہے کہ آئندہ چل کر علوم وتحقیق اور کشف و انکشافات کی صورتحال یہاں تک بلند ہوجائے گی اور ایسے آلات جاسوسی وجود میں آجائیں گے کہ لوگ جانوروں کے ذریعہ خبر معلوم کرلیں گے، اور باریک سے باریک آلات معلومات وجود میں آجائیں گے جن تک رسائی اس قدر آسان ہوگی جیسے جوتے کے تسمے اور کوڑے کی رسی تک رسائی آسان ہوتی ہے۔

مسلمانوں کا لشکر کسی مہم کے لئے نکلتا تو اللہ کے رسول دوران جنگ دعا بھی فرماتے، بعض دعاء میں یہ الفاظ بھی ہوتے:

"وعلی الرطب والیابس فی البر والبحر"

یعنی خشکی میں سفر کرنے والوں اور سمندر میں سفر کرنے والوں پر رحم کر۔ (مسند احمد: ۲۴۰۰۱)

اللہ کے رسول ﷺ کی نظر اس بلندی تک پہنچی ہوئی تھی کہ آئندہ اس طرح کی حد تکنیک کا ایجاد ہونا ہے، مسلمانوں کو اس کی پہلے ہی خبر دی گئی تاکہ وہ ان تکنیک کو پہلے پہل حاصل کرلے۔

اس طرح کی متعدد روایات کتب حدیث میں موجود ہیں جن میں ایجاد وانکشافات کی پیشگی خبر دی گئی، اور خود اللہ تعالیٰ نے اپنے عالم گیر رسول ﷺ کو وہ علوم ومعارف عطا کئے جن سے آپ خود بے خبر تھے، تو عام انسانوں کا کیا کہنا۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہے:

وعلمك ما لم تکن تعلم وکان فضل الله علیکم عظیما۔ (النساء: ۱۱۳)

اللہ نے آپ کو وہ کچھ سکھا دیا جو آپ نہیں جانتے، لوگو! تم پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے خاتم الرسل کو وہ علوم ومعارف، اسرار ولطائف سکھائے جو وہ نہیں جانتے تھے، اور ان علوم سے انسانیت کو فائدہ پہنچے گا، اس لیے یہ تمام دنیا پر اللہ کا فضل ہے۔

چنانچہ مسلمانوں نے قرآن مجید اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عطا کیے ہوئے علوم معارف کی خوب آبیاری کی، انہیں بنیادوں پر اپنی تحقیقات وانکشافات کی مضبوط ترین اور عالیشان عمارتیں قائم کیں، ان میں علوم وفنون کے ماہرین کی بڑی تعداد پیدا ہوئی، ریسرچ وتحقیق کے بڑے بڑے ادارے اور جامعات اس وقت قائم کئے گئے جب اغیار کلیساؤں میں بیٹھے گوپیوں کی بھکتی اور عقیدت میں الجھ کر جنت کے ٹکٹ ان سے خریدنے کے لئے مجبور تھے، جس

طرح آج مغرب ان علوم ومعارف پر مکمل طور سے مسلط ہے۔

مسلمانوں کی علمی سرگرمی دین ودنیا کی تفریق اور تنویت میں الجھی ہوئی ہے، مسلمانوں کا ایک طبقہ وہ ہے جو عبادات وریاضات، طہارت، وضو، غسل، نکاح وطلاق وغیرہ چند مسائل کو دینی علوم قرار دیتا ہے اور حصولِ علم کی تمام قرآنی اور نبوی تاکیدات کو انہیں میں محصور کئے ہوئے ہیں، اور سیاست و معیشت، تحقیقات و انکشافات، قوانین، عدالت، نظام حکومت وغیرہ شعبہ جات کو دنیاوی علم مان کر بعض حضرات انہیں زائد از ضرورت اور بعض ناجائز بلکہ دین کے لئے مضر تک قرار دیتے ہیں، اتفاق سے یہ وہی طبقہ ہے جو واقعی اس رسول کا پیروکار ہے جن کے نظام تعلیم میں علوم معارف کے خزانے ہیں، نئی تحقیقات وایجادات کی طرف اشارات ہیں، قومی اور بین الاقوامی سیاست کے عملی نمونے ہیں، معیشت و تجارت کے تجرباتی اصول وضوابط ہیں۔

چنانچہ علوم میں دین ودنیا کی تفریق کردینے کی بنیاد پر ادارے اور جامعات الگ الگ ہیں، بلکہ افراد واشخاص کا بھی بٹوارہ ہوجاتا ہے، جس کا نتیجہ ہے مسلمانوں کی افرادی قوتیں اور مالی صلاحتیں دو متضاد راہوں پر چل کر اور باہم متعارض ہوکر نہایت کمزور ہورہی ہیں۔

ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ اردو زبان میں اللہ کے رسول ﷺ کے نظام تعلیم وتربیت کا جائزہ پیش کیا جائے، تاکہ اللہ کے رسول ﷺ کے طریقہ تعلیم وتربیت، نصاب، اور آپ کے متعین کردہ مقاصد تعلیم تک اردو داں طبقہ کی رسائی ہو، اور نظام تعلیم وتربیت پر غور وفکر کرنے کا اسے موقع حاصل ہو۔

عصر جدید کے نامور عالم دین، قلم وقرطاس پر مکمل قدرت رکھنے والے اور علم وتحقیق کے نمائندہ مصنف برادر محترم مولانا مجیب الرحمٰن عتیق ندوی حفظہ اللہ نے ہمت کی اور اچھے اور مشکل ترین مباحث کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا، اوراق کے اعتبار سے یہ کتاب بہت ضخیم نہیں ہے، صرف ۱۱۸ صفحات پر مشتمل ہے، لیکن دلائل واستنباط اور بلندی افکار کے اعتبار سے ضخیم ترین ہے، فاضل مصنف نے اللہ کے رسول ﷺ کے نظام تعلیم وتربیت، نصاب تعلیم، طریقہ تعلیم، اسلوب تدریس، صحابہ کرام میں علم کی مقصدیت اور روح جیسے موضوعات کو نہایت جامعیت کے ساتھ کتاب میں جمع کردیا ہے۔

مصنف خود بھی اپنی کتاب کے دیباچہ میں وجہ تالیف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم نے اس مختصر رسالہ میں عہد نبوی کے نظام تعلیم، تصور وروح اور اس کی جامعیت کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، بغیر کسی تنقید وتبصرے اور بہت زیادہ تفصیل کے بجائے صرف یہ جائزہ ذکر کیا ہے کہ عہد نبوی میں کیا نظام تربیت اور کیا منہج واسلوب تھا، صحابہ میں علم کی مقصدیت اور روح کیسی تھی، تاکہ ہم اپنے موجودہ تعلیمی نظام کو عہد نبوی کے نظام اور اس کے معیار پر پرکھ سکیں، اور یہ جائزہ لے سکیں کہ ہم عہد اولی کے تعلیمی نظام وروح سے کتنے دور ہیں''۔

(معلم انسانیت کا نظام تعلیم وتربیت، ص ۲۰)

فاضل مصنف نے اس کتاب میں بہت سے اچھوتے عناوین پر اپنی خداداد فکری صلاحتیوں سے مفکرانہ روشنی ڈالی ہے، اور مکمل صاف گوئی اور حق بیانی کا مظاہرہ کیا ہے، عام طور پر ہمارے روایتی علماء خوش فہمی میں مبتلا ہوکر بہت سی آیات کے مدلولات خود کو ثابت کردیتے ہیں، مثال کے طور پر سورہ فاطر آیت نمبر: ۲۸ میں موجود ''العلماء'' کو ہم جیسے روایتی علماء اپنے اوپر منطبق کرلیتے ہیں، جبکہ نظام بارش اور ایگریکلچر کی لطافت، پہاڑوں کی گہرائیوں میں چھان بین، انسانوں اور چوپایوں کے خلیے، سیلس اور ان کے اجزاء اجسام کی باریک معلومات سے ہمارا ادنی تعلق بھی نہیں ہے۔

مصنف موصوف اسلام کے نظریہ تعلیم وعلم کو بیان کرتے ہوئے اور اس غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مذکورہ آیت سے معروف وروایتی معنی ہیں ''علماء'' کی فضیلت پر استدلال کرنا ناانصافی کی بات ہے، اور سیاق کے خلاف بھی، اس

سے مراد محض رایتی علماء نہیں ہیں، قرآن مجید نے متعدد مقامات پر آفاق وانفس کے اسی مطالعہ اور دلائل ربوبیت کو ایمانی بصیرت کے ساتھ سمجھنے کی دعوت دی ہے'' (ص:۲۳)

آج مغرب اور مغرب زدہ اشخاص کو اصرار ہے کہ علمی تحقیقات اور سائنسی اکتشافات کا موجد مغرب ہے، مصنف نے مضبوط دلائل کی روشنی میں پوری قوت کے ساتھ اس غلط فہمی کی تردید کی، اور یہی حقیقت بھی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے نظامِ تعلیم کا تعصب سے اوپر اٹھ کر جائزہ لیا جائے تو برملا یہ کہا جا سکتا ہے کہ علم ومعرفت، تحقیق واکتشافات کا اصل موجد اسلام ہے، مغرب نے تو مسلمانوں کی بے توجہی اور غفلت شعاری کی وجہ سے ان کی گم شدہ متاع پر قبضہ جما لیا ہے، مصنف ایک جگہ رقمطراز ہیں:

''آج دنیا کو علم وتہذیب کا درس دینے والے مغرب زدہ لوگ کہتے ہیں کہ انہوں نے ہی دنیا کو علم وتمدن اور وسائل تعلیم سے آشنا کرایا ہے، انہوں نے علمی میدان میں اتنی ترقی کی ہے کہ آج پوری دنیا ان کے علم، نصاب تعلیم، نظام تعلیم وتربیت کا نہ صرف لوہا ماننے کے لئے مجبور ہے بلکہ اس کو اختیار کئے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا، اور افسوس تو یہ ہے کہ اس صف میں غیروں کے ساتھ کچھ اپنے بھی معذرت خواہانہ انداز میں دست بستہ کھڑے ہیں، صحیح بات یہ ہے کہ یوروپ علم یا نظام تعلیم وتربیت کا موجد نہیں ہے، بلکہ پیروان اسلام کی متاع گمشدہ کو اس نے حاصل کیا ہے، اور اہل حق اپنی متاع اقبال سے غافل ہو گئے ہیں۔'' (ص ۲۸)

اس کتاب میں نبوی نظام تعلیم کی چار اہم بنیادوں کا تفصیلی تعارف کرایا گیا ہے، جو قرآن مجید کی صریح آیت سے ماخوذ ہیں، تلاوت کتاب، تزکیہ نفوس، تعلیم الکتاب اور تعلیم الحکمۃ۔

ساتھ ہی عہد نبوی کے دو مناہج تعلیم قلیل مدتی اور طویل مدتی کورس کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے، اور عہد نبوی کے اس نظام تعلیم پر بھی مدلل روشنی ڈالی گئی جس میں طالب علم کے ذوق واستعداد اور ضرورت وطلب کو ملحوظ رکھتے ہوئے تعلیم دی جاتی تھی، درسگاہ نبوت کے عنوان کے ذیل میں مصنف لکھتے ہیں:

''اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ نظام نبوی میں طلبہ کی رعایت ملحوظ ہوتی تھی، ان کی ضرورت اور وقت کا بھی خیال ہوتا تھا، گویا آپ ﷺ کا تعلیمی نظام وہ تھا جس کو آج ہم ''طفل مرکوز نظام تعلیم'' (Student centric system) کہہ سکتے ہیں، اس میں متعین نصاب اور مقدار نہیں بلکہ طالب علم کی ضرورت، استعداد و طلب ملحوظ ہوتی ہے۔ (ص:۴۸)

عہد نبوی کے ابتدائی مدارس میں مکہ کے دار ارقم میں قائم مدرسہ اور مدینہ میں مدرسہ صفہ نبوی کا تعارف کراتے ہوئے ان کا مقصد قیام، ان مدارس میں تعلیمی، اصلاحی اور دعوتی منصوبہ بندی، دعوتی حکمت عملی کی ترتیب، مدارس نبوت کے طریقۂ درس وتدریس، کلاس کے اوقات، نظام تعطیل، طلبا کے لئے چھٹیوں کے اوقات میں ذمہ داری اور اس کی منصوبہ بندی وغیرہ دلچسپ موضوعات کو انوکھے اسالیب میں بیان کیا گیا ہے۔

خواتین کا زیور تعلیم سے آراستہ ہونا اہم ترین ضرورت ہے، عہد نبوی میں خواتین کے لئے تعلیم کے کیا انتظامات تھے، اور ان کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے زبان نبوت سے کس قدر تاکیدات وارد ہوئی ہیں، ان سب پر ''تعلیم نسواں کا نظام'' کے عنوان سے تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، جیسے عہد نبوی میں فن طب اور خواتین کی خدمات، عہد نبوی میں خواتین کا شوق شغف وغیرہ مباحث کا خصوصی تذکرہ کیا گیا ہے۔

ترقی کے اس دور میں جا کر اب دنیا کو اب حق تعلیم کا شعور حاصل ہوا اور ''سب کے لئے تعلیم'' کے نعرے بلند ہوئے، جب کہ محسن کائنات ﷺ کی تعلیمی منصبہ بندی میں ''سب کے لئے تعلیم'' کا عملی قانون عہد نبوی کے ابتدائی دور میں ہی منظور ہو گیا تھا، چنانچہ تمام افراد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی تاکیدات کے ساتھ

کامیاب عملی کوششیں کی گئیں، صحابہ کرام میں سے کون سے ایسے صحابی تھے جو اس وقت کے تعلیمی حالات اور تقاضے کے مطابق کس دوسرے معاشرہ کے چیدہ افراد سے بہت زیادہ بلند تہذیب وتمدن اور علوم وفنون کی گہرائی کے حامل نہ تھے؟

مصنف عہد نبوی کے تعلیم مشن کے ذیل میں ''سب کے لئے تعلیم'' کے عملی قانون پر فاضلانہ گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عہد نبوی میں جہاں تعلیم وتعلم اور اشاعت علم کا سلسلہ جاری تھا، کوئی شخص اس چشمہ جاری سے محروم نہیں رہتا تھا، بلکہ لوگوں کو ہدایت تھی کہ جاننے والے نہ جاننے والوں کو سکھائیں، جن کے کان آشنائے علم اور جن کے قلب اس دولت سے مالا مال تھے ان کا فرض تھا کہ علم کو عام کریں، اس دولت پہ خود سانپ بن کر نہ بیٹھیں، اپنی الگ دنیا نہ بسائیں، بلکہ نا آشنائے علم اور نور بصیرت سے محروم انسانوں کو اس دولت سے حصہ دیں، اس طرح عوام الناس کی ذمہ داری تھی کہ وہ خود تلاش کریں اور علم سیکھیں۔ (ص:۸۰)

مصنف نے بہت خوب کہا:

''سب کے لئے تعلیم'' یہ حکم خاص طور پر اس عہد میں بڑی معنویت اور اہمیت رکھتا تھا جبکہ علم پر مذہبی نقطہ نظر سے صرف خواص کی اجارہ داری قائم تھی، یا وہ گرجا گھروں، غاروں اور کلیساؤں میں محدود ہو گیا تھا، علم کے عموم اور اشاعت کا یہ تصور ایک زبردست انقلاب تھا۔ (ص:۸۰-۸۱)

کتاب میں اللہ کے رسول ﷺ کے طرز تدریس اور اسلوب درس کے ذیل میں تھیوری میتھڈ، پریکٹیکل میتھڈ، باہمی سوال وجواب تدریجی مراحل کا لحاظ، توضیحی وسائل تعلیم جیسے تمثیل، نقشہ جات اور خطوط ونشان بنا کر سمجھانا وغیرہ نبوی اسلوب تدریس کو فاضلانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قومی وملکی بلکہ ذاتی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے نصاب تعلیم میں تبدیلی عہد نبوی میں بھی کی جاتی رہی ہے، مثلاً عہد نبوی کے نصاب تعلیم میں اولا فارن لینگویج سیکھنے کا نظم نہیں تھا، اس طرح مکتوب کو خط کی زبان میں لکھنا، علم الانساب علم النجوم اور اصلاح زبان وبیان کے طریقے نصاب میں شامل نہ تھے، لیکن جب دوسری زبان بولنے والوں اور ان کے خطوط کی آمد ورفت ہوئی، ساتھ ہی دیگر علوم کی ضرورت پڑی تو ان سب کو نصاب تعلیم میں شامل کیا گیا، فاضل مصنف نے اس موضوع پر بھی سیر حاصل گفتگو کی اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وقت اور ضرورت کے لحاظ سے جبکہ تعلیم کا مقصد اصلی فوت نہ ہو تو نصاب تعلیم میں تبدیلی اسلام کو خطرے میں ڈالنا نہیں ہے، مصنف نے وقت وضرورت کے لحاظ سے نصاب تعلیم میں تبدیلی پر عہد نبوی سے متعدد دلائل پیش کیے، جو تعلیمی نصاب ونظام کی اصلاح کے لئے نہایت قیمتی اور وقت کی اہم ضرورت ہیں۔

خاص کر ایسے وقت میں جبکہ ہماری قوم کے باشعور اور ذمہ دار اذہان منطق وفلسفہ کی ان گتھیوں کو سلجھانے اور ہیولیٰ اور جزء لا یتجزی کے ایسے لاینحل قضایا کو حل کرنے میں لگے ہیں جن کا اب خیالی دنیا کے علاوہ کہیں بھی انطباق ممکن نہیں ہے، بلکہ دنیائے حقیقت میں ان کا مساوی تو مساوی معکوس انطباق کا بھی تصور نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے اہم ترین موضوع پر قیمتی علمی ذخیرہ فراہم کر کے اسلامی نظام تعلیم کے باب میں حسین اضافہ کیا ہے، مصنف محترم سے ہمارے دیرینہ تعلقات ہیں، لیکن بعد مکانی کی وجہ سے براہ راست یہ کتاب مجھے نہ مل سکی اور نہ ہی کوئی اطلاع، بہرحال اللہ تعالیٰ مصنف کی اس کاوش کو قبول فرمائے، اللہ اسے امت مسلمہ کی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کی واپسی کا ذریعہ بنائے، آمین۔

☆☆☆

❑ روداد

آل یوپی مسابقہ بین المدارس (ملحقہ ندوۃ العلماء)
آل اسکولز مقابلہ سائنس و دینیات کوئز (ضلعی سطح)

منعقدہ مدرسۃ العلوم الاسلامیہ ، ۲۷-۲۸فروری ویکم مارچ ۲۰۱۸ء

محمد عالم ندوی

علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے تحت چلنے والا ادارہ مدرسہ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ دن بدن اپنے علمی وتعلیمی سفر کی نئی نئی جہتیں طے کر رہا ہے ،طلباء کی شکل میں قوم کا مستقبل بہترین بنانا اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہے. نہ صرف مدارس کے طلباء بلکہ عصری درسگاہوں کے طلباء بھی مرکز نظر ہیں. یہ ادارہ قوم کے نونہالوں میں مسابقاتی مزاج کی تشکیل دینا اور قومی دھارے میں شامل کرنا اس وقت کی اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سمجھتا ہے . روایتی نظام کو متنوع بنا کر اور مفید سے مفید تر کا انتخاب کر کے امت کے سامنے پیش کرتا ہے ،اپنے مقاصد کے حصول کی خاطر مختلف ثقافتی پروگرام کراتا ہے، ادارہ کے مدیر محترم جناب ڈاکٹر طارق ایوبی دامت برکاتہم کو اللہ رب العزت نے بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا ہے جو اس ادارے کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہیں، مدرسے کے روایتی نظام میں تنوع پیدا کرنے کا ہنر ان کو اچھی طرح آتا ہے ،سوچ وفکر کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے ، خوب سے خوب تر کی تلاش ان کو ہمیشہ رہتی ہے، کبھی ایک دائرے میں سمٹ کر رہنا ان کے مزاج کے خلاف ہے، جمود وتعطل اور بے فکری سے سخت نفرت ہے، ہر لمحہ جواں اور دواں کی جیتی جاگتی مثال ہیں، یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ اگر حقیقت پسندانہ نظر سے پچھلے کچھ سالوں کا جائزہ لیا جائے اور مدرسہ ہذا میں ہونے والی تعلیمی ثقافتی تبدیلیوں پر غور کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے، 2013 میں رابطہ ادب اسلامی کی سہ روزہ کانفرنس کا ملکی سطح پر انعقاد 2014 میں مولانا علی میاں رحمتہ اللہ علیہ کے افکار کے حوالے سے ایک عالمی اور منفرد کانفرنس 2015 میں آل یوپی مسابقہ بین المدارس ملحقہ ندوۃ العلماء اور اب 2018 میں دوسری مرتبہ آل یوپی مسابقے کا انعقاد اس بات کی بین دلیل ہیں، اسی طرح اسکولوں کے مابین سائنس و دینیات کویز کمپیٹیشن جس کا پہلا مقابلہ 2015 اور دوسرا اب 18 میں ہوا جو مدیر محترم کے فکری دائرے کی کھلی دلیل ہے. اسی طرح مدرسہ کے منتظمین اور اساتذہ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جو ڈاکٹر طارق ایوبی صاحب کے خاکوں میں رنگ بھرنے کا کام کرتے ہیں اور ان کے دست وبازو بنے رہتے ہیں، ان سارے پروگراموں میں بانی ادارہ مرحوم ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی صاحب کی جہد پیہم ، اخلاص اور جذبۂ قربانی، فکر ولگن اور تڑپ کو بڑا دخل تھا، وہ ہمہ وقت سوچتے تھے، ہر وقت رواں دواں رہتے تھے، جوں ہی ان کے سامنے کوئی بات رکھی جاتی، اگر وہ نفع بخش ومفید اور تعمیری ہوتی تو فورا ہی اس کو پورا کرنے کی دھن میں لگ جاتے ، اس کے لیے تدابیر کرتے ، اپنا سب کچھ نچھاور کر دیتے مگر اس کو کر کے ہی چھوڑتے ، اب ان کے صاحبزادگان بالخصوص بڑے صاحبزادے ڈاکٹر محمد سعد ماحی اسی فکر وکڑھن کے ساتھ اس کام کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے فکر وخیال میں ہر وقت مدرسہ، مدرسے کے بچے اور اور مدرسے کی تعلیمی ترقی شامل رہتی ہے، سوچیے ذرا نونہالان امت کی صلاحیتوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے وہ اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر قطر سے تشریف لائے اور پورے پروگرام میں

موجود رہے، ہمہ وقت طلبہ و اساتذہ اور کارکنان کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اللہ ان کی خدمات کو قبول فرمائے اور صحت و عافیت کے ساتھ تادیر سلامت رکھے۔

اس مسابقہ میں تقریبا دس مدارس ملحقہ ندوۃ العلماء کے سوا سو طلباء نے شرکت کی مسلم یونیورسٹی اور ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور مختلف دانشوران نے صدارت اور حکم کے فرائض انجام دیے، افتتاحی اجلاس 27 فروری 2018 کو مدرسہ کے کیمپس میں ہوا، جس کی صدارت پروفیسر مسعود خالد صاحب نے کی، جبکہ مہمان خصوصی مولانا ضیاء الدین ندوی صاحب تھے، ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہوئے ان مسابقات کو منعقد کرانے کا مقصد بیان کیا اور کہا کہ مرحوم ڈاکٹر غیاث صاحب نے اپنی علالت کے زمانے میں ان پروگراموں کو کرانے پر زور دیا تھا، اور الحمدللہ ان کی زندگی میں اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی، وہ اپنی بیماری کے باوجود بنفس نفیس مسابقات میں شریک ہوئے تھے، جناب ڈاکٹر سعد ماحی صاحب نے طلبا سے اپنی خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا یہاں پر مختلف مدارس کے طلباء موجود ہیں اس سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں ایک دوسرے سے سیکھنے کا موقع ملے گا، مولانا ضیاء الدین ندوی صاحب نے اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کہ آج میں ان نوجوان قلم کاروں کو اپنی نظر سے دیکھ رہا ہوں جن کے مضامین پڑھ کر میں ان کو جانتا تھا، انھوں نے طلباء کو مدعو اساتذہ سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے پر ابھارا، آخر میں پروفیسر مسعود خالص صاحب نے پرمغز صدارتی خطاب کرتے ہوئے تمام لوگوں کا شکریہ ادا کیا، پھر باقاعدہ مسابقات کا آغاز ہوا، مسابقات کا سلسلہ ایک مارچ کی دوپہر تک چلا جس میں اردو عربی تقریر، انگریزی تقریر، مقالہ نویسی، اردو عربی بیت بازی کے مقابلے ہوئے 27 فروری کی شام کو ایک شعری ادبی نشست کا انعقاد ہوا جس میں علی گڑھ شہر کے شعراء نے شرکت کی جبکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تشریف لائے مولانا رئیس الشاکری صاحب نے صدارت فرمائی، مشہور شاعر جناب رہبر تابانی صاحب بھی موجود تھے، ان کے ساتھ جناب عمران علی آبادی صاحب بھی آئے تھے، 1 مارچ کی شام میں ایک اجلاس عام کا انعقاد کیا گیا، جس میں دارالعلوم دیوبند کے استاذ مولانا توقیر صاحب کا بیان ہوا موصوف نے رسول اللہ کے اخلاق پر روشنی ڈالی، فرمایا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تاریکیوں میں اجالا کیا تھا، آج زمانے میں سر سے پیر تک تاریکیاں ہیں اور روشنی کے چراغ کم ہیں اور وہ جو ہیں بھی ٹمٹمارہے ہیں مدارس کی شکل میں ان چراغوں کی روشنی کو مضبوط اور بڑھانے کی ضرورت ہے، جناب ڈاکٹر سعد صاحب ماحی صاحب نے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ لوگوں کی دین بیزاری کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ دین کا کام کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کرتے کہ کم از کم آ کر دیکھیں کیسے کام کیا جارہا ہے، اپنے صدارتی خطاب میں مرادآباد سے تشریف لائے مولانا اسجد قاسمی ندوی صاحب نے فرمایا کہ ہمیں اسلامی تہذیب کو اپنانے کی ضرورت ہے لوگوں نے مغربی تہذیب کو سینوں سے لگا رکھا ہے اسلامی تہذیب میں حیا حقوق کی ادائیگی اور مساوات کا درس ملتا ہے، جبکہ مغربی تہذیب کی بنیاد بے حیائی حق تلفی اور عدم مساوات پر مبنی ہے، اسلام میں امن اور سکون ہے جو انسان کو صرف اسلام کے علاوہ میسر نہیں. پروفیسر مسعود خالد صاحب نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جبکہ نظامت مدرسے کے مہتمم جناب ڈاکٹر محمد طارق ایوبی صاحب نے فرمائی، جلسے کے آخر میں تمام طلباء کو انعامات سے نوازا گیا مقابلے کو دلچسپ بنانے کے لئے علامہ سید سلیمان ندوی ٹرافی اور مولانا علی میاں ندوی ٹرافی رکھی گئی تھی مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ کے طلباء نے اول پوزیشن حاصل کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی ٹرافی پر اپنا استحقاق ثابت کیا، جب کہ دوم پوزیشن حاصل کرتے ہوئے مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ کے طلباء نے علی میاں ٹرافی پر اپنا استحقاق ثابت کیا، سائنس و دینیات کوئز مقابلے میں ابن الہیثم ٹرافی علی گڑھ اسلامک اسکول نے حاصل کی، اس مقابلے میں علی گڑھ کے 11 اسکولوں سے 345 طلبہ و طالبات شریک ہوئے تھے، صدر جلسہ مولانا اسجد قاسمی ندوی کی دعا پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

مقابلوں میں پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ

اول پوزیشن

محمد آصف، اردو تقریر علیا، مظہر الاسلام بلو چپورہ
محمد اسامہ، اردو تقریر سفلی، مظہر الاسلام بلو چپورہ
ابوسفیان، عربی تقریر علیا، المعہد الاسلامی، مانک مئو
محمد سلیمان، عربی تقریر سفلی، جامعہ سید احمد شہید، کٹولی
مفضل حسین، انگریزی تقریر علیا، فلاح المسلمین، تیندوا
محمد جنید، انگریزی تقریر سفلی، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ
سیف اللہ، مقالہ نگاری علیا، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ
محمد شہاب الدین، مقالہ نگاری سفلی، فلاح المسلمین تیندوا
سعود عالم، صرف ونحو کوئز، فلاح المسلمین، تیندوا
کامران، عامر اعظم، اردو بیت بازی، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
فیضان اختر، عبدالخالق، عربی بیت بازی، معہد، سکروری

دوم پوزیشن

افتخار خان، اردو تقریر علیا، فلاح المسلمین، تیندوا
اشتیاق احمد، اردو تقریر سفلی، مظہر الاسلام بلو چپورہ
سید احمد، عربی تقریر علیا، جامعہ سید احمد شہید، کٹولی
تنویر اعظم، عربی تقریر سفلی، المعہد الاسلامی، مانک مئو
محمد دانش، انگریزی تقریر علیا، مانک مئو
ابوظفر، انگریزی تقریر سفلی، مظہر الاسلام
عمر غزالی، مقالہ نگاری علیا، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ
محمد ابوظفر، مقالہ نگاری سفلی، مظہر الاسلام
مشرف احسان، صرف ونحو کوئز، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
انتخاب عالم، افتخار احمد، اردو بیت بازی، فلاح المسلمین
عمار اعظمی، فرحان عالم، عربی بیت بازی، معہد، سکروری

سوم پوزیشن

عرفان خان، اردو تقریر علیا، المعہد الاسلامی، مانک مئو
محمد نور حسن، اردو تقریر سفلی، المعہد الاسلامی، مانک مئو
اشتیاق فیاض، عربی تقریر علیا، معہد، سکروری
اشتیاق احمد، عربی تقریر سفلی، فلاح المسلمین
اسرار الحق، انگریزی تقریر علیا، نور الاسلام، کنڈہ
عالیہ رضا، انگریزی تقریر سفلی، اے، ایم، یوگرلز اسکول
عبدالرؤف، مقالہ نگاری علیا، فلاح المسلمین
محمد فرحان، مقالہ نگاری سفلی، مظہر الاسلام
سحر عالم، صرف ونحو کوئز، دار العلوم فاروقیہ، کاکوری

تشجیعی انعام

صادق عالم، اردو تقریر علیا، مظہر الاسلام
محمد فیضان، اردو تقریر علیا، معہد سکروری
محمد طلحہ، اردو تقریر سفلی، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
ابوالحسن، عربی تقریر علیا، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
خبیب الرحمٰن، عربی تقریر سفلی، فلاح المسلمین
محمد ابصار، انگریزی تقریر علیا، مدرسۃ العلوم الاسلامیہ
محمد عمر، انگریزی تقریر سفلی، مانک مئو
عبیداللہ، مقالہ نگاری علیا، معہد سکروری
محمد مونس، مقالہ نگاری سفلی، مانک مئو
ولی کریم، صرف ونحو کوئز، مانک مئو

سائنس اینڈ اسلامک اسٹڈیز کوئز

گروپ A، اول: ارمغان، علی گڑھ اسلامک اسکول۔ دوم: انشاء، النور پبلک اسکول۔ سوم: محمد معاذ، علی گڑھ اسلامک اسکول۔ تشجیعی: (۱) محمد فیض عارف، علی گڑھ اسلامک اسکول (۲)، سعدیہ ملک، اے. ایم. یو. گرلز اسکول (۳) محمد کامران، ایس. ٹی. ایس. اسکول۔

گروپ B: اول: دلناز پروین، اے. ایم. یو. گرلز ہائی اسکول۔ دوم: محمد سعد، اقرا پبلک اسکول۔ سوم: محمد رضا، بلیک ڈیل پبلک اسکول۔ تشجیعی: (۱) محمد طیب، دی بلوسم اسکول۔ (۲) شہاب احمد، دی بلوسم اسکول۔ (۳) سید محمد خضر، ایس. ٹی. ایس. ہائی اسکول۔

انگریزی تقریر (علیا طالبات)

ماریہ افسر (اول) اے ایم یوگرل اسکول
بصرہ حسن رضوی (دوم) اے ایم یوگرل اسکول
تسنیم حسین (سوم) اے ایم یوگرل اسکول
عالیہ رضا (سوم) اے ایم یوگرل اسکول
سومیا سرسوتی (تشجیعی) اے ایم یوگرل اسکول

☆☆☆

شریعت میں اعتدال مطلوب ہے

(م۔ق۔ن)

آنحضرت ﷺ کبھی کبھی رات کے وقت صحابہ کرامؓ کو دیکھنے کے لئے باہر نکلا کرتے تھے۔ایک مرتبہ جب آپؐ نکلے تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ تہجد کی نماز میں آہستہ آہستہ آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کررہے ہیں، جب آگے بڑھے تو دیکھا کہ حضرت عمر فاروقؓ بہت زور زور سے قرآن کریم کی تلاوت کر رہے ہیں، اس کے بعد آپ واپس گھر تشریف لے آئے۔صبح فجر کی نماز کے بعد جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو آپؐ نے ان سے پوچھا کہ رات کو ہم نے دیکھا کہ آپ نماز میں بہت آہستہ آہستہ قرآن کریم کی تلاوت کررہے تھے،اتنی آہستہ آواز میں تلاوت کیوں کررہے تھے؟ حضرت صدیقی اکبر رضی اللہ عنہ نے جواب میں بہت خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا: انھوں نے فرمایا کہ یارسول اللہ"أسمعتُ من ناجيتُ" میں جس سے مناجات کررہا تھا اس کو سنا دیا، اس لئے مجھے آواز زیادہ بلند کرنے کی ضرورت نہیں، جس ذات کو سنانا مقصود تھا اس نے سن لیا، اس کے لیے بلند آواز کی شرط نہیں۔اس کے بعد آپؐ نے حضرت عمر فاروقؓ سے پوچھا کہ آپ اتنی زور سے کیوں پڑھ رہے تھے۔

انہوں نے جواب میں فرمایا کہ "اوقظ الوسنان واطرد الشيطان" میں اس لئے زور سے پڑھ رہا تھا تا کہ جو سونے والے ہیں ان کو جگاؤں اور شیطان کو بھگاؤں۔

پھر آپ ﷺ نے حضرت صدیق اکبر سے فرمایا کہ "ارفع قليلاً" تم ذرا بلند آواز سے پڑھا کرو اور حضرت فاروق اعظم سے فرمایا کہ "اخفض قليلاً" تم اپنی آواز کو تھوڑا سا کم کردو۔ (ابوداؤد، کتاب الصلاۃ حدیث نمبر ۱۳۲۹)

یہ واقعہ بہت ہی مشہور ہے جو احادیث میں منقول ہے اور اس کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس حدیث میں اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے کہ نہ بہت زیادہ اونچی آواز سے پڑھو اور نہ بہت زیادہ پست آواز سے پڑھو اور یہ قرآن مجید کے عین ارشاد کے بھی مطابق ہے۔اس لئے کہ قرآن کریم میں ہے کہ "ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا" کہ نماز میں نہ بہت زیادہ زور سے پڑھو نہ بہت زیادہ آہستہ پڑھو بلکہ ان دونوں کے درمیان اعتدال کے ساتھ پڑھو۔

لیکن آج ہماری زندگی کے ہر شعبے میں بے اعتدالیاں پائی جاتی ہیں، نکاح میں، طلاق میں، خلع میں، عبادت میں، معاملات میں، لین دین میں، خرچ میں، کاروبار میں، دینی مجلس اور محفل قائم کرنے میں، ذکر میں، تلاوت میں، کوئی بھی ایسا شعبہ ایسا نہیں ہے جہاں ہم افراط وتفریط اور بے اعتدالی کے شکار نہیں ہیں، خاص طور پر شادی بیاہ کے موقع پر جو بے اعتدالیاں اور فضول خرچی پائی جاتی ہے اس سے شاید ہی کوئی گھر محفوظ ہو، اس حدیث نبوی کی روشنی میں ہمیں اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے اور زندگی کے تمام شعبوں میں اعتدال اور توازن سے کام لینا چاہیے۔

(م۔ق۔ن)